ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۴۵

چوتھا سال: نویں کتاب

ستمبر ۲۰۰۶ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey_90@hotmail.com
فون: ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶

کمپوزنگ: اظہر خان (یونی کارن کمپیوٹرز چونگی نمبر ۶ ملتان)
قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

انٹرویو:

۲۔ احمد ندیم قاسمی سے گفتگو — آصف فرخی — ۴

مضامین:

۳۔ پاکستانی مقتدرہ کی نظریاتی تعبیریں اور اُردو کے نمائندہ باغی ادیبوں کی ثقافتی پذیرائی — ڈاکٹر انوار احمد — ۱۷

۴۔ مسلم نشاۃ الثانیہ کی نقیب ___ علی گڑھ تحریک — فرح ذبیح — ۳۱

افسانے:

۵۔ شوشو — ڈاکٹر طاہر مسعود — ۴۵

۶۔ کہانی سے پہلے کا ماجرا — محمد امین الدین — ۵۰

۷۔ وہ، ماسی اور مسز ابراہیم — احمد اعجاز — ۵۳

۸۔ باجو — راحت ثمرین خان — ۵۷

غزلیات:

۹۔ ظفر اقبال (۸ غزلیں)، خیال امروہوی (۲ غزلیں)، ابرار عابد (ایک غزل)، اسلم سحاب ہاشمی (۲ غزلیں)، شارق بلیاوی (۲ غزلیں)، حصیر نوری (۲ غزلیں)، صابر عظیم آبادی (۲ غزلیں)، پرویز ساحر (ایک غزل)، اوصاف نقوی (۲ غزلیں)، عظیم حیدر سیّد (ایک غزل) — ۶۳

نیم پابند غزلیں:

۱۰۔ ۹ غزلیات (خاور اعجاز) — ۷۶

سید عامر سہیل

چند باتیں

مجید امجد کی نظم ''جن لفظوں میں ہمارے دلوں کی بیعتیں ہیں'' کو پڑھ کر لفظ اور اُس کے بے اعتبار ہونے (اور ہوتے چلے جانے) کا شدت سے احساس ہوتا ہے یقیناً ہمارا عمل کردار اور نیت ہی لفظ کے معنی میں اثر پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے آدرش، ہمارے نظریات اور ہمارے خیالات کے جوش سے لفظوں کے انبار لگے ہوئے ہیں اور ہر روز یہ انبار بلند سے بلند تر اور وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جاتے ہیں مگر ان لفظوں سے تاثیر، اثر پذیری اور خلوص ایسی صفات کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب ہزاروں سطروں کے بعد چند سطریں ہی روشن اور زندہ نظر آتی ہیں۔ سیاہ حروف سے پھوٹنے والی روشنی اب بجھتی جا رہی ہے۔ لفظ مر رہے ہیں اور ہم ہر روز انہیں موت کے گھاٹ اتارتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم ہزاروں لفظ لکھ کر شاید یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خود کو زندہ کر رہے ہیں۔ مگر جناب لفظ کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ یہ اپنے خالق کے گرد ہالہ بناتے ہیں اسے اپنی روشنی سے منور کرتے ہیں اور دوام بخشتے ہیں مگر جھوٹے لفظ، مصنوعی جذبے اور خلوص سے عاری لفظ خود اپنے خالق کو اُس کی زندگی ہی میں موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔ جھوٹے لفظ بہت بے مروت ہوتے ہیں۔ یہ قلم سے نکل کر بظاہر بے جان اور مردہ دکھائی دیتے ہیں مگر وقت آنے پر بغیر کسی کو خبر دیئے یہ زندہ ہوتے ہیں اور پھر اپنی خالق کی رسوائی اور بدنامی کا نشان بن جاتے ہیں۔ یہ اُسے گھیر لیتے ہیں اور بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑتے۔ لکھنے والا ہزار کوشش کرے ہزار منت سماجت کرے مگر لفظ کبھی اُس کا اعتبار قائم نہیں ہونے دیتے۔ یہ اپنے خالق کو مارنے اور بے اعتبار کرنے کے بعد خود بھی تحلیل ہو جاتے ہیں، ہمیشہ کے لیے اپنے وجود کو ختم کر لیتے ہیں۔ لفظ خودکش حملہ آور کی طرح خود بھی مرتے ہیں اور اپنے خالق کو بھی مار دیتے ہیں۔

تحلیل ہو جانے کے بعد یہ لفظ پھر سے نئے خالق کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ وہ قلم کی نوک سے، ذہن کی گہرائیوں سے اور فکر کی بلندیوں سے ابھرتے اور نمودار ہوتے ہیں۔ اور پھر احتساب کا یہ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اگر انہیں پرخلوص خالق مل جائے تو وہ تا قیامت اُس کے تابع فرما ہو کر اُس کے ساتھ رہتے ہیں اور اپنے خالق کو مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتے ہیں۔

اب بھی ہزاروں لاکھوں لفظ اپنے خالق کو تلاش کر رہے ہیں۔ ہم آپ سبھی ان کے منتظر ہیں مگر۔۔۔ رُکیے۔۔۔ کہیں ہم لفظوں کو بے جا ضائع تو نہیں کر رہے۔

☆☆☆

آصف فرخی

احمد ندیم قاسمی سے گفتگو

آصف فرخی: قاسمی صاحب! اس وقت آپ ہمارے بزرگ ترین اور محترم ادیبوں میں سے ایک ہیں، آپ جب اپنی پچھلی ادبی زندگی پر، جو کئی دہائیوں پر محیط ہے، پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو آپ کے ذہن میں کیا تاثر اُبھرتا ہے؟

احمد ندیم قاسمی: مجھے بڑا اطمینان محسوس ہوتا ہے کیونکہ میں نے اپنے ضمیر کے ساتھ کبھی کوئی سودا نہیں کیا۔ میرے جو موضوعات ابتداء میں تھے ان میں تبدیلیاں بھی آئیں، ان میں پھیلاؤ بھی پیدا ہوا، میں شہر میں بھی آ بسا، شہری متوسط زندگی کے بارے میں بھی میں نے کہانیاں لکھیں اور بعض اونچے طبقے کے دوست تھے تو ان کے ساتھ دو تین بار، یوں کہیے کہ جو نام نہاد اعلیٰ سطح کی سوسائٹی تھی، اس میں بھی شرکت کی ہے۔ اس کا بھی عکس میرے افسانوں میں ___ میرے بعض افسانوں میں موجود ہے۔ لیکن محسوس میں نے یہ کیا ہے کہ کسی بھی مقام پر میں ڈگمگایا نہیں اور اب تک اس نقطۂ نظر، اس نظریے، اس موقف پر میں قائم ہوں جو آغاز میں تھا لیکن اس میں تبدیلی تو آتی رہتی ہے اور تبدیلی آتی رہنی چاہیے اس لیے کہ انسان کا دل اور دماغ بالکل ٹھس تو نہیں ہوتا۔ ان میں ہر قسم کی تبدیلی آ سکتی ہے۔ وہ تبدیلی میرے یہاں بھی آئی لیکن بنیاد وہیں موجود ہے اور اس لیے مجھے۔۔۔ میں جب اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، اگرچہ اس سے بہتر ہونا چاہیے تھا مگر جو کچھ میں نے لکھا ہے اس معیار تک میں شاید ابھی تک نہیں پہنچ سکا جو میرے ذہن میں تھا۔ شاعری کے بارے میں بھی اور فکشن کے بارے میں بھی لیکن بہرحال جو کچھ میں نے کیا ہے، اس کے سلسلے میں، میں مطمئن ہوں۔

آصف فرخی: آپ نے جس موقف کا ذکر کیا ہے کہ جس پر آپ قائم رہے، کیا آپ یہ کہیں گے کہ کم و بیش وہی موقف ہے جو ترقی پسند تحریک کا موقف رہا ہے؟

احمد ندیم قاسمی: جی، جی بالکل! وہی ہے۔ بس اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ میں بنیادی طور پر مسلمان ہوں۔ میں خدا اور رسولؐ کی نفی کر کے کسی بھی صورت میں کسی نظریے کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میں ایک تو مذہبی گھرانے سے تعلّق رکھتا ہوں، دوسرا یہ کہ میں نے مطالعہ بھی کیا ہے دینیات کا۔ میرے بعض دوست تھے، جیسے سجاد ظہیر تھے، سبطِ حسن تھے۔ انہوں نے مجبور کیا دو تین چار بار کہ میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جاؤں۔ تو میں نے کہا کہ اگر آپ کو قبول ہو کہ

میں خدا کا بھی اعلان کروں، نعت بھی لکھوں اور ساتھ ہی مسلمانوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے بھی کام کرتا رہوں تو پھر میں کمیونسٹ ہوسکتا ہوں۔ وہ اُنہیں قبول نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس زمانے میں انتہا پسندی تھی ان کے نظریے میں بھی۔ خدا کے نفی کر کے بات کرتے تھے۔ میں کبھی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں ہوا۔ جب سیّد سجاد ظہیر گرفتار ہوئے تو وہ جس مقام پر تھے، وہاں تلاشی لی گئی تو وہاں ان کے نام میرا خط بھی برآمد ہوا۔ اس خط کو ہمارے جو حکام ہیں، کے لیے جو بے چارے اُردو نہیں سمجھ سکتے، اس خط کو انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ حکام نے کہا کہ اس میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے جو ایسی قابلِ اعتراض ہو۔ اس زمانے میں، میں نظر بند تھا۔ پھر میرے گھر پر حملہ ہوا۔ میری تلاشی لی گئی، تو اس میں میرے نام کا سجاد ظہیر کا خط نکل آیا۔ اس کا بھی ترجمہ ہوا اور دونوں خطوں کو سامنے رکھ کر دیکھا گیا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ وہ جو میرا خط ہے، اس کی نقل ہی مجھے مل جائے لیکن آپ کو اندازہ ہے جو ہماری پولیس کا موقّف ہوتا ہے اس سلسلے میں۔۔۔ میرا نظریہ ترقی پسندی کا تھا اور ہمیشہ وہی رہا۔ جب میں سیکرٹری جنرل تھا پروگریسو رائٹرز کا، اس وقت بھی میں یہی کہتا رہا کہ ضروری نہیں ہے کہ آپ نفی کر دیں اسلام کی یا عیسائیت کی یا ہندومت کی یا کسی بھی مذہب کی۔ نفی کر کے آگے بڑھنا، خاص طور پر ایشیا میں مشکل اور غلط ہے۔ ان کو سمجھانے کی بھی کوشش کی کہ کمیونزم کی اور سوشلزم کی جو صورت مارکس نے اور اینگلز نے پیش کی تھی، وہ چین میں آ کر بدل گئی۔ اس لیے کہ چین کے حالات ایسے تھے۔ اس لیے ان حالات کے مطابق بڑھنا چاہیے۔ ورنہ ناکامی اور شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میری یہ بات نتیجہ خیز ثابت ہوئی، اس لحاظ سے کہ وہی کچھ ہوا جو میں نے کہا تھا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ تحریک کو انتہا پسندی کا شکار کر دیا گیا۔ بائیکاٹ ہوئے ادیبوں کے، اس سلسلے میں ریزولیوشن پاس کیے گئے جن میں اتنے بڑے بڑے ادیب۔۔۔ جن میں منٹو شامل تھے، جن میں قرۃ العین حیدر شامل تھیں، جن میں راشد شامل تھے، ان کی نفی کر دی گئی کہ یہ ہمارے رسالوں میں نہیں چھپ سکتے۔ میں نے اور ابراہیم جلیس مرحوم نے، ہم دونوں یہ پوری کوشش کی کہ یہ قرارداد منظور نہ ہو۔ اس لیے کہ ہمارے اپنے پاس تو کوئی رسالہ نہیں تھا۔ دوسرے لوگ رسالے نکالتے تھے اور ہمیں مُدیر مقرر کرتے تھے۔ یہ ریزولیوشن اگر پاس ہو گیا اور ان ادیبوں کو شامل کرنا ترک کر دیا ہم نے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ محدود ہو گئی اس کی ریڈرشپ اس طرح تو مالکان ہم سے رسالے واپس لے لیں گے اور یہی ہوا۔ ''سویرا'' بھی اور ''ادبِ لطیف'' بھی اور ''نقوش'' بھی، سارا قصّہ ختم ہو گیا۔ (وقفہ) یہ ہے میرا نظریہ اور وہی ہے جو ابتداء میں تھا۔ اس میں اگر کوئی تبدیلی آتی ہے تو مُثبت تبدیلی آتی ہے۔ Negation کی طرف میں جاتا ہی نہیں۔

اس لیے کہ میں نہ نا اُمید ہونا جانتا ہوں نہ شکست خوردہ ہونا مجھے پسند ہے اور اگرچہ اُمید کا جو موقّف ہوتا ہے، اس میں یہاں پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر بڑی چوٹیں لگتی ہیں، بڑی ضربیں پڑتی ہیں، لیکن اس کے باوجود میں اپنے موقّف پر قائم ہوں کہ کوئی نہ کوئی صورت بہتری کی نکل ہی آئے گی۔

آصف فرّخی: آپ کا جوادبی سفر رہا ہے، اس میں ایک بات بڑی منفرد ہے اور وہ یہ کہ آپ بیک وقت دو میدانوں میں فن کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ نثر میں، افسانہ نگاری اور پھر نظم۔ آپ کی دونوں میں نمایاں حیثیت ہے اور یہ اعزاز کم ہی لوگوں کے حصّے میں آیا ہے کہ وہ نظم و نثر دونوں میں اس طرح ممتاز ہوں جیسے کہ آپ ہیں۔ تو کیا آپ۔۔۔ اوّل تو اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، اس دوہرے امتیاز کے بارے میں اور پھر کیا آپ بنیادی طور پر اپنے آپ کو شاعر سمجھتے ہیں یا افسانہ نگار سمجھتے ہیں، یا پھر آپ اس فرق کو ہی سرے سے غیر ضروری سمجھتے ہیں؟

احمد ندیم قاسمی: میرے خیال میں یہ بحث ہونی ہی نہیں چاہیے کہ میں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہوں۔ لیکن میں اس بات کو، جو آپ بھی تسلیم کریں گے اور پڑھا لکھا ہر آدمی تسلیم کرے گا کہ شاعری بزمِ فنونِ لطیفہ کی صدر نشین ہے۔ میں نے آغاز شاعری سے کیا۔ میں افسانہ نہ لکھتا اگر میرے کالج فیلو نہ ہوتے محمد خالد اختر، وہ ابتدا ہی سے فکشن پڑھتے تھے، انگریزی فکشن، رابرٹ لوئی اسٹیونسن کے تو وہ عاشق تھے۔ اس کے ساتھ ہی رائیڈر ہیگرڈ اور پریسٹلے وغیرہ کو پڑھتے تھے اس زمانے میں۔ انہوں نے ''شی'' اور ''ریٹرن آف شی'' جیسے ناول بھی مجھے پڑھوائے اور مجھ سے کہا کہ تم افسانہ بھی لکھو۔ تو یہ افسانہ نگاری میں نے اپنی شاعری کے آغاز کے پانچ چھ سال بعد شروع کی۔ اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میرے اندر ہے، میرے باطن میں جو کچھ ہے اس کا اظہار میں شاعری میں کرتا ہوں، ساتھ ہی افسانے میں بھی وہی کچھ کرتا ہوں۔ بعض اوقات میں سوچ رہا ہوتا ہوں کہ کسی نظم کے بارے میں، تو اس میں سے کوئی پہلو ایسا نکل آتا ہے کہ بیٹھ کر افسانہ لکھنے لگتا ہوں۔ شروع شروع میں میری افسانہ نگاری پر میری شاعری بھی مُسلّط رہی ہے۔ یہ آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ لیکن اس کے بعد جب میرا افسانہ ''سنّاٹا'' آیا اور دوسرے افسانے مثلاً ''رئیس خانہ'' وغیرہ تو اس کے بعد ایک رو ایسی آئی میرے ذہن میں کہ اب میں کوئی بھی غیر ضروری لفظ یا کسی قسم کے کوئی تشبیہات و استعارات وغیرہ استعمال نہیں کرتا۔ سیدھے سادے انداز میں مختصر طور پر ایک افسانہ مکمل کرتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں کہ میں نے ایک Compact افسانہ لکھ لیا۔۔۔

آصف فرخی: یعنی یہ تبدیلی آپ کے افسانہ لکھنے کے انداز میں آئی ہے۔۔۔

احمد ندیم قاسمی: جی ہاں! میں نے تبدیلی خود محسوس کی ہے۔ میں جب پڑھتا ہوں اپنے افسانے، مثلاً ''طلوع وغروب'' جو میرا ایک پُرانا افسانہ ہے تو بعض اوقات لطف بھی آتا ہے اور بعض مقامات پر ہنسی بھی آتی ہے کہ یہ میں کیا کرتا رہا۔ بہرحال یہ جو ہے ایک سلسلہ اپنے آپ کو سنورانے کا یہ مسلسل جاری رہا۔

آصف فرخی: ۔یہ جاری رہنا بھی چاہیے۔۔۔

احمد ندیم قاسمی: جی ہاں۔

آصف فرخی: آپ کی جو تازہ ترین کتاب ہے افسانوں کی ''کوہ پیما'' تو اس میں ایک فرق کا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس کہانی میں ایک علامتی معنویت بھی ہے اور یہ انداز آپ کی پچھلی کہانیوں میں، مثلاً ''طلوع وغروب'' اور ''چوپال'' وغیرہ جیسی کہانیوں میں نہیں ہے۔ یہ تبدیلی وقت کے ساتھ ساتھ آئی ہے۔۔۔

احمد ندیم قاسمی: جی ہاں! ان کہانیوں میں یہ نہیں ہے۔۔۔اب جو میرے دوست افسانہ نگاروں کے ہاں، خاص طور سے اسلام آباد کے افسانہ نگاروں کے ہاں ایک رو چلی تھی Abstract افسانے لکھنے کی۔ علامتی افسانے کا میں مخالف نہیں ہوں۔ لیکن Abstraction جو ہے، وہ لے جاتی ہے شاعری کے قریب یا جسے آج کل لوگ نثری نظم کہتے ہیں، اس کے قریب۔ تو وہ کسی صورت میں ہماری ریڈرشپ کو قبول نہیں۔ ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اگر علامت ہمارے آس پاس کی ہے تو وہ توجہ کو کھینچ لیتی ہے لیکن میں نے علامتی افسانہ کبھی نہیں لکھا۔ البتہ میں یہ دعویٰ ضرور کرتا ہوں کہ میرے جو کردار ہوتے ہیں وہ صرف ایک فرد نہیں ہوتے بلکہ ایک بہت بڑے سوشل سرکل کی نمائندگی کرتے ہیں، اس لیے وہ کردار ایک علامت بن جاتا ہے۔

آصف فرخی: جیسے ''وحشی'' کی وہ جو دیہاتی عورت ہے تو مجھے شک ہوتا ہے کہ وہ گاؤں کی سیدھی سادی عورت نہیں بلکہ دراصل ایک ملک کی علامت ہے؟

احمد ندیم قاسمی: جی، جی بالکل،

آصف فرخی: تو کیا آپ کے ذہن میں یہ افسانہ لکھتے وقت یہ معنی موجود تھے؟

احمد ندیم قاسمی: جی ہاں! بالکل موجود تھے۔ جس طرح جب وہ اس کے ساتھ جو عورت بیٹھی ہے اس سے گفتگو کی کوشش کرتی ہے اور اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ٹکٹ کے پیسے ایک صاحب نے دیے ہیں تو وہ نہایت سفاکانہ انداز میں اس پر حملہ آور ہوتی ہے۔ حالاں کہ اس نے اپنی طرف سے مہربانی کی ہے۔ لیکن وہی بات جو آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ ایک علامت ہے، خودداری اور حمیت والی شخصیت ہے جو ہمارے ملک اور قومی کردار کی نمائندگی کرتی ہے۔

آصف فرخی: آپ نے ابھی اپنے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے ''سناٹا'' کا نام لیا۔ مجھے آپ کی یہ کہانی

سب سے زیادہ پسند ہے۔ اور اس کہانی کے بارے میں مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ آپ کی افسانہ نگاری کا نقطۂ عروج ہے اور اس لڑکی کا جو دُکھ ہے وہ بہت کمال کے ساتھ آپ نے دکھایا ہے لیکن اس کہانی کی فضا آپ کی باقی کہانیوں سے ہٹی ہوئی ہے۔۔۔

احمد ندیم قاسمی: جی ہاں! مختلف ہے۔ شہری زندگی ہے ایک تو اور وہ بھی لاہور کے اندرون کی، اندرونِ شہر، پُرانا لاہور۔ وہاں جو حویلیاں ہیں، وہاں کا ماحول ہے اور میرے ذہن میں۔۔۔ بنیاد اس کی ہے اور میرے ذہن میں ایک آدھ کردار تھا۔ اس کے گرد میں نے کہانی کا سارا تانا بانا تیار کیا۔ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ بہت ہی مختلف ہے میرے دوسرے افسانوں سے۔ فضا بھی مختلف ہے اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ محمد حسن عسکری، جو ابتدا میں تو میرے بڑے گہرے دوست تھے، بعد میں ہمارے نظریاتی اختلافات ہو گئے تھے، تو انہوں نے شاید ''ساقی'' میں ''جھلکیاں'' لکھتے ہوئے یا کہیں اور یہ لکھا تھا کہ اس پورے سال میں صرف ایک افسانے نے نصف حد تک متاثر کیا ہے، اور وہ ہے ''سناٹا''۔ نصف حد تک، ایک بٹہ دو! (قہقہہ) یہ بھی ان کا بات کرنے کا طریقہ تھا۔ اس لیے کہ وہ افسانہ میرا لکھا ہوا تھا اور مجھ سے ان کے اختلافات تو تھے۔

آصف فرخی: اس نصف کا تعین کیا انہوں نے؟

احمد ندیم قاسمی: بس اتنا ہی لکھا تھا۔

آصف فرخی: قاسمی صاحب! ادھر افسانے آپ کے کافی کم ہو گئے ہیں۔ کچھ اس بارے میں بتائیے کہ یہ کیا ہو گیا ہے اور ایسا کیوں ہوا ہے؟

احمد ندیم قاسمی: آصف صاحب! اس وقت میں آپ کو کیا عرض کروں کہ کوئی ایک درجن افسانوں کے مکمل خاکے، مکمل کردار اور مکمل فضا میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور میں نے ایک ایک سطر میں ان کو نوٹ بھی کر رکھا ہے کہ ان کو لکھوں گا۔ لکھنے کو میرا جی چاہتا ہے۔ لیکن ایک تو عمر۔۔۔ وہ کچھ نہیں کرنے دیتی۔ بڑھاپا ہے۔ تھک جاتا ہوں، پڑھتے ہوئے بھی تھک جاتا ہوں، لکھتے ہوئے بھی تھک جاتا ہوں۔ اس تخلیقِ فن کے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے۔ چاہے وہ شاعری ہو یا چاہے افسانہ ہو۔

آصف فرخی: اچھا! قاسمی صاحب آپ تھکتے بھی ہیں؟

احمد ندیم قاسمی: جی ہاں! عمر کا تقاضا ہے۔

آصف فرخی: آپ کو دیکھ کر یا آپ کو پڑھ کر تو نہیں لگتا۔ آپ کی تازہ تحریریں بھی بالکل ویسی ہیں۔۔۔

احمد ندیم قاسمی (ہنستے ہوئے): میں تھوڑا بہت پڑھتا رہتا ہوں۔ اسی پڑھنے سے بعض بڑی اچھی اچھی باتیں سوجھتی ہیں، جو ہم سے بہتر ذہنوں نے یا ہم سے مختلف ذہنوں نے سوچی ہیں۔ لیکن

اب ایک تو مشکل یہ ہے ناں جی کہ ایک تو مجھے روزگار کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ نوکری جو ہے، ''مجلسِ ترقی ادب'' کی نظامت یہ اسی سلسلے میں کرتا ہوں۔ ''جنگ'' میں میری کالم نگاری بہت کم ہو چکی ہے، مہینے میں دو، تین کالم ہیں۔ لیکن بہرحال کرتا ہوں۔ کرنا تو پڑتا ہے۔ اور پھر اصل وقت جو ہے لکھنے پڑھنے کا، وہ شام کے بعد کا ہے، کھانے کے بعد، نو بجے کے بعد کا وقت ہے جب میں بیٹھتا ہوں۔ بعض افسانے میں نے آدھے لکھے ہوئے ہیں بعض ایک چوتھائی لکھے ہوئے ہیں۔ یعنی میں لکھ رہا ہوں۔ نیت میری خراب نہیں ہے، افسانے کے سلسلے میں اور مجھے امید ہے کہ میں سال، ڈیڑھ سال کے اندر ایک نیا مجموعہ تیار کر لوں گا۔ اتنے بہت سے موضوعات ہیں اور بیش تر کرداروں پر افسانے لکھنے کے بارے میں، میں نے سوچا ہے۔ کچھ اپنے دیہات کے بارے میں، کچھ یہاں شہروں کے بارے میں۔ لکھ لوں گا۔ لیکن رفتار واقعی کم ہے۔ یہ آپ درست کہتے ہیں۔ لیکن اسی طرح شاعری کی بھی کم ہے۔ غزل کا تو چلتے پھرتے بھی کوئی شعر ذہن میں آجاتا ہے۔ نظم لکھنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ایک تسلسل ہوتا ہے، سوچ کا اور خیال کا، پھر اسے Wind-up کرنا ہوتا ہے۔ وہ بہت بڑا مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کا بھی مجھے وقت کم ملتا ہے۔ لکھتا ہوں۔ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ نظم ہو جاتی ہے، ایک آدھ غزل ہو جاتی ہے۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ تکلیف وقت کی کمی کی ہے۔

آصف فرخی: کیا یہی وجہ ہے کہ آپ ناول نہیں لکھ پائے؟

احمد ندیم قاسمی: اچھا! ناول کا یہ ہے کہ میرے ذہن میں پورا ناول موجود ہے، محفوظ ہے پورا ناول۔ ایک ناول، بس زیادہ نہیں اور اس ناول کی جو کیفیت ہے وہ یہ ہے وہ ایک قیدی تھے، میرے ساتھ نظر بند تھے۔ وہ تھے سلہری صاحب کی جماعت کے اور کسی سلسلے میں نظر بند ہو گئے تھے۔ انہوں نے کچھ ذاتی واقعات بیان کرنے شروع کیے۔ وہ ریٹائرڈ تحصیل دار تھے۔ انہوں نے کچھ واقعات ایسے سنائے جن کی Base پر میں نے ناول کی تیاری شروع کی، نوٹس لینے شروع کیے وہیں جیل کے اندر۔ پھر میں باہر آیا تو لکھنا شروع کیا۔ ایک باب لکھا، دوسرا باب لکھا۔ پھر وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ وہ دو باب میرے پاس محفوظ پڑے ہیں، پھر ابھی چند روز پہلے میں اپنے پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں اپنے مضامین وغیرہ مرتب کر رہا ہوں۔ اب میں یہ بھی کر رہا ہوں کہ کچھ شخصیات ہیں، ادب کی شخصیات، ان کے بارے میں اپنی یادداشتیں لکھوں۔ تو اس طرح میری ایک طرح کی آٹو بائیوگرافی بھی ہو جائے گی۔ مثلاً منٹو کے بارے میں، میں نے مضمون لکھا۔ آپ نے پڑھا ہوگا۔ اس طرح راشد کے بارے میں مضمون ابھی ''معاصر'' میں چھپا ہے۔ اسی طرح کرشن چندر کے بارے

میں اور پھر دوسرے بزرگوں کے بارے میں، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی وغیرہ کے بارے میں میرا ارادہ ہے۔ اس طرح دس پندرہ، بیس شخصیات ہیں۔ ابن انشا ہیں مثلاً۔ اس طرح میرا ارادہ ہے کہ ان مضامین کی الگ کتاب ہو گی۔ اسے یادداشتیں ہی سمجھ لیجیے۔۔۔ یہ بات میں نے کس سلسلے میں کہی تھی؟

آصف فرخی: آپ ذکر کر رہے تھے ادھورے ناول کا۔۔۔

احمد ندیم قاسمی: جی ہاں! ناول کا میں ذکر کر رہا تھا۔ تو جی چاہتا ہے کہ ناول لکھوں اس لیے کہ ناول میں افسانے کی نسبت زیادہ آزادی ہوتی ہے۔ افسانہ جکڑ لیتا ہے۔ یعنی جس طرح نظم لکھی جاتی ہے، اسی طرح افسانہ لکھا جاتا ہے۔ آپ تو خیر افسانہ نگار ہیں، آپ کو یہ تجربہ ضرور حاصل ہوا ہوگا۔ لیکن ناول میں ذرا کھل جاتا ہے آدمی۔۔۔ تو میں وہ دیکھ رہا تھا کاغذات اپنے۔ ان میں مجھے پینسل سے لکھا ہوا اپنا ایک مضمون ملا، آزادی سے پہلے کا لکھا ہوا مضمون ملا۔ ''ایک ریوڑ، ایک انبوہ'' اس کا عنوان تھا۔ یہ مضمون نہیں تھا افسانہ تھا ___ طویل افسانہ۔ میں نے دل میں کہا، یہ کیا عنوان ہوا۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا اور ایسا لگا جیسے کوئی نئی چیز ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں ہمارے دیہات میں نوجوانوں کی بھرتی کی جاتی تھی۔ یہ افسانہ فوج میں نوجوانوں کی بھرتی کے سلسلے میں ہی تھا۔ آغاز وہاں سے ہوتا ہے، پھر اس کے بعد وہ سپاہی فوج میں بھرتی ہو کر ٹریننگ حاصل کرتا ہوا برما کے محاذ پر چلا جاتا ہے۔ جاپانیوں کے ہاتھوں ہانگ کانگ میں گرفتار ہوتا ہے، جاپانی جو سلوک کرتے ہیں اس کے ساتھ، اس کا مفصل ذکر ہے۔ پھر دوسرے قیدی، ان کا مختلف قسم کا ردعمل ہے۔ کوئی بہادر ہیں، کوئی بے چارے بزدل ہیں، کوئی رو رہے ہیں، کوئی ہنس رہے ہیں۔ وہاں سے پھر واپسی ہوتی ہے۔ اس دوران پاکستان قائم ہو چکا ہے۔ تو قعات کا ایک انبار اُٹھائے وہ واپس آتا ہے۔ لیکن اسے شدید شکست ہوتی ہے اس لیے کہ اس کے دیہات کے وہ لوگ جنھوں نے پاکستان کے مخالفت کی ہے، وہی اس وقت پاکستان کے ٹھیکے دار بنے ہوتے ہیں، وہ چاہے نمبردار ہوں، چاہے زمین دار ہوں۔ وہ افسانہ میں نے انجام تک پہنچایا ہوا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اسے Re-write کر دوں۔ ناول لکھنے کا شوق تو تھا، چنانچہ میں نے ایک دو طویل افسانے لکھے، آپ نے پڑھے ہی ہوں گے۔ ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' اور ایک، دو اور افسانے۔ شوق میرا ہمیشہ رہا ہے لیکن مجھے وقت نہیں ملا، مجھے مہلت نہیں ملی۔ اور مہلت اس لیے نہیں ملی کہ میں کسی امیر گھرانے سے تعلق نہیں رکھتا۔ ایک سیدھے سادے غریب گھرانے سے تعلق تھا اس لیے مجھے روزی روزگار کے لیے بہت محنت کرنی پڑی۔

آصف فرخی: خدا کرے کہ اب آپ کو اتنی مہلت مل جائے کہا آپ کچھ کہانیاں تو اور لکھیں! ناول بھی لکھ

دیں تو کیا اچھا ہو۔۔۔

احمد ندیم قاسمی: ہاں کہانیاں تو اور لکھوں گا۔ میں جب رات کو سونے لگتا ہوں تو کوئی نہ کوئی کہانی میرے ذہن میں آجاتی ہے۔ میں اس پر Work کرتا ہوا سو جاتا ہوں اور صبح اُٹھتا ہوں تو کچھ نوٹس لے لیتا ہوں۔

آصف فرخی: اچھا! کہانیوں کی بات کر رہے ہیں۔ ابھی آپ نے مطالعے کا ذکر بھی کیا تھا تو اُردو کے کون سے افسانہ نگار آپ کو بار بار یاد آتے ہیں اور ان کی تحریروں میں ایک گونہ مناسبت معلوم ہوتی ہے؟

احمد ندیم قاسمی: جی ہاں! اصل میں میرا آغاز تو منشی پریم چند کے مطالعے سے ہوا دیہات کا معاملہ تھا، میں بھی دیہاتی تھا۔ وہیں میرے گاؤں کے اسکول میں چھوٹی سی لائبریری تھی۔ اس میں سید امتیاز علی تاج کا ایک ادارہ تھا، دارالاشاعت، اس کی چھپی ہوئی دو کتابیں تھیں، پریم بتیسی اور پریم پچیسی۔ یہ میں نے پڑھیں۔ وہاں سے میں پریم چند سے بہت متاثر ہوا۔ لیکن بعد میں مجھے اپنے اُردو کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ راجندر سنگھ بیدی نے متاثر کیا، اگرچہ اس کی زبان سے نہیں، اس کی کردار نگاری اور افسانے کی بنت سے بہت متاثر ہوا۔ منٹو تو میرے بہت ہی قریب دوست تھے۔ منٹو بہت سیدھے سادے انداز میں کہانی لکھتا ہے اور یہ بھی اس کی ایک خوبی ہے، بعض ایسے مقامات بھی آتے تھے اس کے افسانے میں جب میں اگر افسانہ لکھتے ہوئے ایسے مقام پر آتا تو تھوڑی سی شاعری بگھارتا۔ منٹو ایسے مقام سے آگے نکل جاتا ہے۔ منٹو کے علاوہ عصمت ہیں۔ ان کے ساتھ غلام عباس ہیں۔ گو کہ افسانے انہوں نے بہت کم لکھے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ادھیڑ عمر کے تھے تب غلام عباس نے افسانے لکھنے شروع کیے لیکن بہت اچھے افسانے لکھے۔ باہر کے جو افسانہ نگار ہیں، دوسری زبانوں کے، ان میں سب سے زیادہ چیخوف مجھے پسند ہے۔ اگرچہ میں نے گوگول بھی پڑھا ہے، گورکی بھی پڑھا ہے، موپاساں بھی پڑھا ہے، سمرسٹ ماہم بھی پڑھا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ صحیح معنوں میں افسانہ نگار چیخوف ہے۔

آصف فرخی: شاید اس لیے کہ اس کے ہاں ایک دھیما پن ہے، پھر دیہات کے لیے ایک محبت اور نرم دلی ہے جو آپ کے مزاج سے بھی قربت رکھتی ہے؟

احمد ندیم قاسمی: اسی لیے شاید۔۔۔ میں نے تجزیہ تو نہیں کیا لیکن میں واقعی قربت محسوس کرتا ہوں اس شخص سے، اس کی کہانیوں سے، جو کچھ اس نے لکھا ہے۔ بعض کہانیاں تو ایسی ہیں، مثلاً۔۔۔ نام مجھے یاد نہیں رہتا، اپنی ہی کہانیوں کے نام یاد نہیں رہتے۔۔۔ وہ کہانی جس میں ایک گاڑی بان کچھ کہنا چاہتا ہے کسی سے مگر کہہ نہیں سکتا اور آخر اپنے گھوڑے سے کہہ دیتا ہے۔ ایسی

مثالیں دوسرے افسانہ نگاروں میں بہت کم ملتی ہیں اور اگر ملتی بھی ہیں تو ذرا Crude انداز میں۔ چیخوف کے سے پاکیزہ، ستھرے اور ڈائریکٹ اور بے ساختہ انداز میں نہیں ملتی ہیں۔

آصف فرخی: آپ کے معاصرین سے آگے چلیں تو آپ کے بعد کے لکھنے والے ہیں ان میں سے کون سے لوگ ہیں جن کی تحریریں آپ کو پسند آتی ہیں؟

احمد ندیم قاسمی: مجھے افسوس یہ ہے کہ میرے بعد کے افسانہ نگاروں۔۔۔ ہاں، اس دور کا ذکر بعد میں کروں گا۔ میرے بعد کے افسانہ نگاروں میں میری بہنیں، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور بہت اچھے افسانے لکھتی رہیں۔ پھر اشفاق احمد ہیں۔ کیا کیا کہانی اپنے دور میں انہوں نے لکھی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ایک بہت ہی ذہین افسانہ نگار دوسرے مکروہات میں پڑ گیا۔ اے حمید نے شروع میں بہت اچھے افسانے لکھے۔ قرۃ العین حیدر بھی اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہوں نے بڑے اچھے افسانے لکھے۔ مہندر ناتھ، کرشن چندر کے بھائی۔۔۔ ہاں، ان افسانہ نگاروں میں، میں کرشن کا نام ضرور شامل کروں گا۔ اس لیے کہ میرے ذہن کے زیادہ قریب تھے۔ منٹو اور بیدی اور عصمت اور غلام عباس کے ساتھ کرشن چندر کا نام آتا ہے۔ بعد میں ترقی پسندی نے کچھ اتنا زور پکڑا ان کے ذہن میں کہ وہ افسانے کے آخر میں کچھ نتائج بھی نکالنے لگے تھے۔ میں نے ایک خط میں انہیں لکھا بھی تھا کہ یہ کیا کرتے ہیں آپ؟ اور پھر میں نے جب ایک افسانہ لکھا ''پہاڑوں کی برف'' تو مجھے کرشن چندر نے خط لکھا پسندیدگی کا اور آخر میں لکھا کہ ''یادش بخیر، ہم بھی کبھی ایسے افسانہ لکھا کرتے تھے۔'' (قہقہہ) تو اس کے بعد یہ جو گروپ ہے، اس کے بعد یہ ہمارے دوست آئے علامت نگار اور تجرید نگار ان میں اب جو نکھر کے سامنے آیا ہے وہ محمد منشا یاد ہے۔ اچھی کہانی لکھ رہا ہے، بہت اچھی کہانی، اگرچہ یہی شروع میں علامت نگاری کی طرف مائل تھا۔ اور علامت نگاری کوئی گناہ نہیں ہے۔ مثلاً مظہر الاسلام کی ایک کہانی چھاپی تھی میں نے ''فنون'' میں۔ اس میں وہ ایک ویگن میں سفر کر رہا ہے اور راولپنڈی سے اسلام آباد جا رہا ہے، اور ایک مسافر کی گٹھڑی اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی ہے۔ جو کردار مظہر نے منتخب کیا ہے، اس کو یہ تشویش ہے کہ یہ گٹھڑی گر جائے گی۔ آخر تک یہی ہوتا رہتا ہے۔ اصل میں اس نے پاکستان کی جو صورت حال ہے اس کو Symbolic انداز میں اس گٹھڑی کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔ اور ہمارے قاری کو اس کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ وہ سمجھ جاتا ہے۔ لیکن یہ جو Abstraction آئی ہے اس نے بہت خراب کیا ہے ہمارے افسانے کو۔ مثلاً یہ لکھا جانے لگا کہ میں نے اپنے باطن میں سیڑھی لگائی اور اس کے ذریعے اپنے اندر اُتر گیا۔ اس طرح کی باتیں ہیں جن کا ہمارا قاری عادی نہیں ہے اس چیز کا پھر آصف صاحب! میں نے محسوس کیا کیونکہ میں تو پارٹیشن سے پہلے بھی ادبی

رسالوں کی ایڈیٹری کر رہا تھا اور اب تک کر رہا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ ہمارے قارئین کیا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ افسانے پر جھپٹتے تھے ادبی رسالوں میں، پھر اس کے بعد شاعری پر۔ اب اس کے بعد صورت حال یہ پیدا کر دی ہے ہمارے علمات نگاروں، تجرید نگاروں نے کہ افسانہ پڑھتا ہی نہیں قاری اور اگر کوئی افسانہ چھپ گیا ہے تو وہ ایڈیٹر کو لکھتے تھے کہ یہ معمہ کیا ہے، ہمیں بتائیے۔ یہ افسانہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے، آپ نے کیوں چھاپا۔ یہ جو ہمارے افسانے کی ریڈرشپ سب سے زیادہ تھی، وہ محدود ہوگئی۔ پھر یہ ہو گیا کہ لوگ رسالوں میں نظمیں، غزلیں اور پھر تنقیدی مضامین پڑھنے لگے اور اس کے بعد کہیں افسانے کی باری آتی تھی۔ لیکن اب صورتِ حال بدل رہی ہے۔ اب اچھے اچھے افسانہ نگار، جن میں آپ بھی شامل ہیں، سامنے آئے ہیں ہمارے ہاں اسلام آباد میں نیلوفر اقبال ہیں۔ پھر بیٹی منصورہ احمد نے کتاب چھاپی ہے فرحت پروین کی۔ وہ اچھا لکھ رہی ہیں اور بھی کئی اچھے نام ہیں وقت وقت ذہن میں نہیں آ رہے۔ لیکن وہ جو ایک مایوسی کی صورت پیدا ہوگئی تھی افسانے کے سلسلے میں، وہ ختم ہوگئی ہے۔ اب پھر افسانہ اپنے آپ کو پہچان رہا ہے۔

آصف فرخی: یہ تو افسانے کی صورت ہوئی۔ شاعری میں بھی بڑی تبدیلی آئی ہے۔۔۔

احمد ندیم قاسمی: جی تبدیلی بہت آئی ہے لیکن مثبت تبدیلی۔ شاعری کے سلسلے میں، میں بہت پرامید ہوں، اس لیے کہ نظم ہو یا غزل ہو، ہمارے نوجوان شعراء ہم سے بڑھ کے ہیں، وہ ہم سے آگے کی سوچ رکھتے ہیں۔ ہم پچھلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اب زمانہ کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔ پچھلی پون صدی میں جو انسانی ذہن نے ترقی کی ہے، وہ ان کے سامنے ہے اس لیے وہ بات بھی نئے انداز میں کرتے ہیں۔ غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے کہ روایت سے مربوط رہنا پڑتا ہے اس میں۔ لیکن اسی میں ایسے ایسے شعر کہتا ہے آج کا نوجوان شاعر کہ آپ دم بخود رہ جاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے بعد آنے والوں میں سلیم احمد مرحوم کا ایک شعر مجھے کبھی بھولتا ہی نہیں۔ یہ شعر اس سے پہلے کے شعراء کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس دور میں ہی کہا جا سکتا تھا۔

یہ سوچا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں
اب اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں

آصف فرخی: واہ واہ! کیا شعر منتخب کیا ہے، کیا کیفیت ہے!

احمد ندیم قاسمی: اس طرح کے شعر اسی زمانے میں کہے جا سکتے ہیں۔ پھر ایک اور شعر ہے۔ یہ جمیل الدین عالی کا شعر ہے:

کچھ نہ تھا یاد بجز کارِ محبت، اک عمر
وہ جو بگڑا ہے و اب کام کئی یاد آئے

میرا ایک شعر ہے:

یہ ارتقاء کا چلن ہے کہ ہر زمانے میں
پُرانے لوگ نئے آدمی سے ڈرتے تھے

یہ وہی بات ہے۔ تو میں یہ کہتا ہوں کہ نئے آدمی سے ڈرنا ترک کر دیجیے اور فراخ دلی سے کام لیجیے۔ میں اپنے ایج گروپ سے اور اپنے فوراً بعد آنے والی نسل سے بھی یہی کہتا ہوں کہ جب کوئی شاعر بہت اچھی غزل کہتا ہے یا بہت اچھی نظم لکھتا ہے تو اسے دل کھول کر، پوری فراخ دلی کے ساتھ داد دیجیے۔ اسی طرح اگر کوئی نئی کہانی سامنے آئی ہے تو بجائے اس کے کہ اس میں سے مین میخ نکالیں، اس کی کھل کر داد دیجیے۔ اس سے آپ کی بزرگی یا ادب میں آپ کا جو مرتبہ ہے، اس میں کوئی کمی نہیں آ جائے گی۔ بلکہ اس میں اضافہ ہوگا۔

آصف فرخی: قاسمی صاحب! یہ آپ نے بہت خوش گوار بات کہی ہے۔ آپ کا یہ مزاج رہا ہے، خاص طور پر ''فنون'' کے مُدیر کے طور پر۔ لیکن ہمارے ہاں عمومی رویہ کچھ اور رہا ہے۔ ہمارے بزرگ ادیب جو عمر میں اور ادبی مرتبے میں تھوڑے بہت بڑھے ہیں، وہ اپنے بعد آنے والوں کو یا تو پڑھتے ہی نہیں ہیں یا ان کی تحریر پر کوئی تاثر ظاہر کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ یا پھر کوئی مثبت یا تعمیری بات نہیں کہہ سکتے۔ ہماری ادبی سیاست نے یہ عجیب کروٹ لی ہے۔

احمد ندیم قاسمی: اچھا یہ جو آپ نے پہلے کہا کہ پڑھتے نہیں ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ آپ نے درست کہا، وہ پڑھتے ہی نہیں ہیں۔ ایک نہایت ہی محترم بزرگ تھے، نام لینا ضروری نہیں ہے۔ تھے بیوروکریٹ لیکن ادب سے ان کا رشتہ تھا، تعلق تھا۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگے کسی ملاقات میں کہ راشد اور فیض کے بعد بھی کوئی شاعری واعری ہوئی ہے؟ مجھے بڑا افسوس ہوا۔ میں نے کہا کہ انہوں نے پڑھنا ترک رکھ دیا ہے، میں نے ان سے کہا کہ جی، اقبالؒ کے بعد بھی لوگ یہ کہتے تھے کہ اب کیا پڑھنا شاعری کو۔ اقبال کے بعد اب اور کیا شاعری ہوگی۔ غالب کے بعد کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ ایسا شاعر آئے گا جو غالب کی سی شہرت حاصل کرے گا۔ میں نے ان سے کہا، آپ نا اُمید نہ ہوں، ایسے نوجوان ہیں۔ کہنے لگے کہ نام لو۔ میں نے کہا کہ نام لینا بے کار ہے۔ آپ تو پڑھتے ہی نہیں ہیں۔ میں بہت دکھی ہوتا ہوں جب یہ طبقہ تنقید کرتا ہے اور یہ سوچے بغیر تنقید کرتا ہے کہ جس بات پر وہ تنقید کر رہے ہیں اس کے مافیہہ کا انہیں علم نہیں ہے اور نوجوان لکھنے والوں نے آخر لکھا کیا ہے۔ چاہے اس نے افسانہ لکھا ہو یا ڈرامہ لکھا ہو یا نظم لکھی ہو۔

آصف فرخی: بزرگوں کے رویے کی بات آ گئی تو میں اب یہ سوال پوچھنا چاہوں گا کہ آپ ماشاءاللہ سے ہمارے بزرگ ادیبوں میں سے ہیں اور کئی مرتبہ آپ کو پاکستانی ادب کا ایک نمائندہ سمجھا جاتا

ہے۔ اسی حوالے سے لوگوں کو آپ سے توقعات بھی ہوتی ہیں کہ جیسے ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں آپ کی آواز میں سارے پاکستانی ادیبوں کی آواز شامل ہے۔ اسی توقع کے تحت لوگوں نے آپ پر تنقید بھی کی ہے۔ خاص طور پر اس کانفرنس میں شرکت کے حوالے سے جو مارشل لاء کے دور میں جب ادیبوں کو جمع کیا گیا تھا۔ اس میں آپ کی شرکت کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر جاننا چاہتا ہوں؟

احمد ندیم قاسمی: میں یہ کہتا ہوں اور میرا یہ وہ موقف ہے جو میں نے تحریراً بھی کئی بار بیان کیا ہے کہ دو کانفرنسوں میں، میں نے حصہ لیا۔ یعنی دو اہلِ قلم کانفرنسوں میں اور دونوں مارشل لاء کے دنوں میں ہوئیں۔ پہلی کانفرنس کا موضوع تھا، حکومت اور ریاست بلکہ مملکت میں نے کہا کہ حکومت کیا ہوتی ہے؟ حکومت عارضی چیز ہے۔ ایک انتظام ہے۔ ہم جب چاہیں اس کو بدل دیں، اگر ہمارے لیے وہ کارآمد نہیں ہے۔ یہ میں نے مارشل لاء کے دنوں میں اعلان کیا۔ میں نے کہا کہ اصل چیز ہے مملکت۔ ہم اپنی مملکت کے وفادار ہیں۔ ہم کسی حکومت کے وفادار نہیں ہیں۔ اسی طرح دوسری کانفرنس کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوئی کہ میرے دوست شفیق الرحمٰن صاحب اس زمانے میں اکیڈمی کے چیئرمین تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کلیدی خطبہ تمہارا ہوگا۔ پچھلی کانفرنس میں بھی میرا کلیدی خطبہ تھا اور میں وہ پڑھ چکا تو بے شمار لوگوں نے کہا کہ اس خطبے کے بعد کانفرنس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ اس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔ دوسری کانفرنس کے لیے بھی میں نے خطبہ لکھا۔ کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ہی وہ انہوں نے ایوان صدر بھیج دیا۔ اس کا جواب لکھوایا گیا اور صدر صاحب نے جو تقریر کی وہ میری تقریری سے پہلے کی جو میری تقریر کا جواب تھا۔ میں نے آزادئ اظہار اور آزادئ تحریر کی بات اُٹھائی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ ہم لکھیں گے اور ہر صورت میں لکھیں گے۔ نہیں لکھیں گے تو مر جائیں گے۔ باقی رہی یہ بات کہ ہمیں اپنی تحریر کے لیے کوئی اجر چاہیے تو ہمیں اس اجر کی کوئی ضرورت نہیں اور پھر میں نے اپنا وہ شعر بھی پڑھا تھا۔

ندیم کوئی میرے فن کا اجر کیا دے گا
میں خاک چاٹ کے بھی نشۂ ہنر میں رہوں گا

تو اس وقت حاضرین کو یوں لگا جیسے میں صدر کو جواب دے رہا ہوں حالاں کہ وہ مجھے جواب دے رہے تھے۔ میرے اس خطبے کے جواب میں ضیاء الحق نے ادیبوں کو بُری طرح جھاڑ اور اشارتاً مجھے اور میرے دوستوں کو وطن دشمن تک کہہ ڈالا۔ صرف ایک بار جب مجھے ستارۂ امتیاز ادبی خدمات کے سلسلے میں دیا گیا تو اس آمر سے مصافحہ کیا اور یہ میرا گناہ شمار کیا گیا حالاں کہ یہ میرے وطن کا اعزاز تھا۔ میرا گناہ شاید یہ تھا کہ میں نے ضیاء کے مارشل لاء کے دنوں میں بعض

دوسرے اہلِ قلم کی طرح ترکِ وطن نہیں کیا، کیا وہ لوگ راہِ راست پر تھے جو ان کانفرنسوں کا بائیکاٹ کر کے اپنے آپ کو انقلابی ثابت کرتے رہے یا میں، جس نے سرکاری پلیٹ فارم پر سے مارشل لاء سرکار پر نہایت کڑی تنقید کی، کہنے والے جو چاہتے ہیں کہتے رہتے ہیں۔ کچھ دوستوں نے میری نعت گوئی پر بھی اعتراض کیا اور اس دور کے فوجی حکام کو خوش کرنے کا وسیلہ قرار دیا جب کہ میں نعت گوئی اپنی شاعری کے آغاز سے کرتا رہا ہوں۔ میں ایک بار پھر وہی بات کہتا ہوں کہ میں نے اپنے اصولوں اور نظریوں کی سودے بازی کبھی نہیں کی۔ میں نے آمریت کے حق کبھی کوئی ایک لفظ تک نہیں لکھا اور جب ضیاء الحق کے دور ہی میں مجھ سے ایک انٹرویو میں پوچھا گیا کہ ضیاء نے جو ریفرنڈم منعقد کیا ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، تو میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ اس ریفرنڈم سے بڑا فراڈ شاید ہی کسی ملک کی تاریخ میں برپا ہوا ہو۔ اس صورت میں کیا میں مجرم ہوں یا وہ میرے ترقی پسند دوست جو خود درخواست کر کے آمر ضیاء الحق سے گھنٹوں لمبی ملاقاتیں فرماتے رہے۔ میں ایک بار اور آخری بار واضح کر دوں کہ میرا دامن ہمیشہ صاف رہا اور اب تک صاف ہے اور زندگی رہی تو آئندہ بھی صاف رہے گا اور یہ میرے ہی اشعار ہیں جو میرے ایمان کا اظہار ہیں۔

میں وہ شاعر ہوں جو شاہوں کا ثنا خواں نہ ہوا
یہ ہے وہ جرم جو مجھ سے کسی عنواں نہ ہوا

☆

سُوکھی ہوئی ٹہنی پہ میں جل جاؤں گا، لیکن
قسمت سے طلب موسمِ باراں نہ کروں گا

(اکتوبر ۱۹۹۸ء، لاہور)

☆☆☆

ڈاکٹر انوار احمد

پاکستانی مقتدرہ کی نظریاتی تعبیریں اور اُردو کے نمائندہ باغی ادیبوں کی ثقافتی پذیرائی

ہر نظریاتی ریاست میں ہر تخلیق کار کی آزمائش ہوتی ہے کہ وہ منظور شدہ لفظوں میں بولتا رہے، سرکار دربار میں پذیرائی حاصل کرے یا پھر ہکلاہٹ کو زبان دے اور ایک غیر منظّم اضطراب کو بامعنی بنائے، یوں اُس کا بھرم یا ساکھ سرکار کی نظروں میں تو نہیں رہتی مگر معاشرے کے کمزور اور بے بس لوگوں میں نہ صرف اُس کا اعتبار قائم ہوتا ہے بلکہ وہ ایسے باغی کی شخصیت کے گرد ایک رومانی ہالہ بھی بنا دیتے ہیں۔ پاکستان میں اِس طرح کی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے تین چار باتوں کو ذہن نشین کرنا چاہیے کہ ایک تو مُلّا کی سخت گیری، یک رُخے پن اور فتویٰ بازی سے غیر مذہبی حکمران طبقات نے ہمیشہ فائدہ اُٹھایا۔ اس لیے عوام میں ملامتیہ رنگ رکھنے والے صوفی، بھگت اور رِند ہمیشہ مقبول رہے۔ یوں اشرافیہ کی تہذیب و ثقافت اور نچلے طبقے کے رہن سہن ہی نہیں مابعد الطبیعاتی تصورات اور تعبیرات میں بھی ہمیشہ فاصلہ رہا۔ دوسرے، جنگ عظیم دوم کے دوران ہی امریکہ کی دلچسپی عالمِ اسلام میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی اِس لیے کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ اتاترک نے اپنی ڈائری میں برطانیہ کو ہدفِ تنقید بنایا مگر ترکی میں امریکی سفیر کو اپنا دانش مند دوست قرار دیا۔ بغداد پیکٹ اور سینٹو میں عراق کے ساتھ ایران، ترکی اور پاکستان کی رکنیت اور امریکہ کی سرپرستی کی قبولیت جیسی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ میں سب سے فعال کردار فوج کا رہا ہے۔ فوج کے بعض سینئر افسروں کے سیاسی عزائم قیامِ پاکستان سے پہلے ہی یعنی قائداعظم کی موجودگی میں ہی اقتدار پر قابض ہونے کے رہے ہیں۔ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے دوسرے اہم رکن یعنی بیوروکریسی کے نمائندہ ایک پاکستانی وزیراعظم چودھری محمد علی نے اپنی کتاب ''ظہورِ پاکستان'' میں ایک معنی خیز واقعہ لکھا ہے: ''بریگیڈیئر کے، ایم، کری آپا سے ایک مسلمان فوجی افسر نے کہا اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر سیاسی لیڈر بھاڑ میں جائیں، اس سے بہتر یہ ہوگا کہ تقسیم ہونے کی جگہ فوج ہی دونوں ڈومینیئنوں کا انتظام خود سنبھال لے۔'' [ص ۲۳۲] گمان غالب ہے کہ یہ مسلمان فوجی افسر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان تھے جو دَس برس پاکستان پر حکمران رہے۔ اِسی طرح ۹/مارچ ۱۹۵۱ء کو فوجی افسروں اور بائیں بازو کے بعض دانشوروں کو اس الزام کے تحت گرفتار کیا گیا کہ یہ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہے تھے، اسے پنڈی سازش کیس کا نام دیا گیا، اس سازش کے سرغنہ میجر جنرل

اکبر خان کا موقف یہ تھا ''۲۳/فروری ۱۹۵۱ء کے روز میرے گھر میں آخری میٹنگ ہوئی، جسے پنڈی سازش کیس بنا کر خوب مشہور کیا گیا، اس میٹنگ نے سات گھنٹوں کی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مجوزہ کارروائی پر عمل نہیں کیا جائے گا۔'' [میجر جنرل اکبر خان، (ترجمہ عنایت اللہ) ''کشمیر کے حملہ آور اور پنڈی سازش کیس''، ص ۱۹۹۔] تاہم وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مجوزہ کارروائی میں یہ سب کچھ شامل تھا ''پرانی حکومت کو برطرف کر دیا جائے، نگران سول گورنمنٹ بنائی جائے، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کے لیے تاریخ مقرر کی جائے، آئین بنانے کے لیے آئین ساز اسمبلی بنائی جائے، انتخابات میں غیر جانب داری قائم رکھنے کے لیے فوج کی غیر جانب دار مشینری استعمال کی جائے اور تمام جرنیلوں کی ایک مشاورتی کونسل بنائی جائے۔'' [ایضاً، ص ۱۹۹] بہر طور فوج، بیوروکریسی اور پاکستان کے جاگیردار پھر بڑے تاجروں کے مشترک مفادات نے جو سنڈیکیٹ تشکیل دیا، اسکی سرپرستی ہمیشہ امریکہ نے کی، اس لئے بائیں بازو کی سیاست کو ہمیشہ وفاقِ پاکستان بلکہ آئیڈیالوجی کے لئے خطرہ خیال کیا گیا۔ اور اس کے لئے امریکہ نے پاکستانی افواج کے سربراہ کے طور پر اپنا آدمی یا اپنے مفادات کے قریب تر آدمی کو پسند کیا۔ اس طرح کے معاہدوں کے لئے جواز یہ بھی پیش کیا گیا کہ بھارت نے پاکستان کے وجود یا تقسیمِ ہند کو قبول نہیں کیا، اس لئے نظریہء پاکستان کے بنیادی اجزا میں مذہبیت اور بھارت دشمنی کا رنگ نمایاں رہا۔

خالد بن سعید نے لکھا ہے کہ ۱۹۵۰-۱۹۵۸ء کے عرصے میں پاکستان نے سات وزرائے اعظم اور ایک کمانڈر انچیف کو دیکھا، جب کہ اس عرصے میں بھارت میں وزیراعظم تو ایک رہا مگر کمانڈر انچیف بہت سے ہوئے ["Politics in Pakistan", P.32]۔ اسی طرح یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ جب ۱۹۵۳-۱۹۵۴ء میں امریکہ اور پاکستان کے درمیان جنگی امداد کے موضوع پر مذاکرات جاری تھے، تو امریکہ کی خواہش تھی کہ پاکستان کے گورنر جنرل کی بجائے کمانڈر انچیف ہی صدر امریکہ آئزن ہاور سے معاملات طے کریں [Mohammad Ahmad, "My Chief", P.75-76]۔ اسی طرح یہ بھی کوئی راز نہیں کہ ۱۹۵۴ء میں اُس وقت کے گورنر جنرل اور بیوروکریسی کے ایک اور سازشی نمائندہ نے دستور ساز اسمبلی کو کالعدم قرار دینے سکندر مرزا نے پاکستان کے پہلے دستور (۱۹۵۶ء) کی تنسیخ اور اسمبلیوں کی برطرفی کا فیصلہ کر کے ۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لاء نافذ کیا، تو وہ بھی مسلح افواج کی تائید پر بھروسے کا عملی اظہار تھا، چنانچہ اس نے جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور وزیراعظم بنا دیا [Ibid, P.9]۔ یہ اور بات کہ جنرل محمد ایوب خان نے ۲۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اقتدار پر قبضہ کیا تو محض چھ ماہ بعد یعنی ۱۸/اپریل ۱۹۵۹ء کو پروگریسو پیپرز یعنی ''پاکستان ٹائمز''، ''امروز'' اور ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے دفاتر پر قبضہ کیا گیا، اِن جرائد کے باضمیر صحافی (مظہر علی خان، احمد ندیم قاسمی اور سیّد سبط حسن) مستعفی ہو گئے، 'پاکستان ٹائمز' کے چیف ایڈیٹر فیض احمد فیض کو دسمبر ۱۹۵۸ء میں ہی

گرفتار کرلیا گیا تھا چنانچہ ''پاکستان ٹائمز'' لاہور کا ۱۹/اپریل ۱۹۵۹ء کا اداریہ ''نیو لیف'' کے نام سے ایک دانشور بیوروکریٹ قدرت اللہ شہاب نے لکھا۔ کچھ عرصے بعد اشفاق احمد کو ''لیل ونہار'' کا ایڈیٹر بنا دیا گیا چنانچہ یہ بہت اہم بات ہے کہ روحانی مکاشفوں کے دعووں اور پاکستان کے بارے میں فکرمندی کے بلند آہنگ اظہار کے باوجود شہاب اور اشفاق احمد کو ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ کا کارندہ خیال کیا گیا۔ ایوب خان کو ہر ڈکٹیٹر کی طرح اقتدار کی طوالت سے دلچسپی رہی، اگرچہ اس کے دور میں نظریۂ پاکستان کی متشددانہ پرچارک جماعت، جماعتِ اسلامی کو ریاستی وسائل پر تصرف کے مواقع نہ ملے، لیکن اس کی تلافی جنرل ایوب کے جانشیں جنرل یحییٰ کے دور میں ہوگئی، جب امیرِ جماعتِ اسلامی میاں محمد طفیل نے جنرل کی قائم کردہ کارنیلئس کمیٹی کی سفارشات کو عین اسلامی قرار دیا تھا، اسی طرح مشرقی پاکستان میں اسی جماعت نے الشمس اور البدر کے نام سے جو مسلح رضا کار تنظیمیں فوج کے تعاون سے بنائیں اور پھر وہاں کی حقیقی سیاسی قیادت کے خلاف آرمی ایکشن کے بعد یک طرفہ ضمنی انتخابات کا سوانگ رچایا گیا، اُس میں بھی پارلیمنٹ کی نشستوں کا ایک بڑا کوٹہ اسی جماعت کو منتقل ہوا لیکن اِس جماعت کو حسبِ منشا نظریۂ پاکستان کی تعبیر کا موقع پاکستان کے پہلے منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا تختہ اُلٹنے والے جرنیل ضیاالحق کے دَور میں ملا۔ ضیاالحق کے نفسِ ناطقہ کے طور پر اِس جماعت میں تعلیم اور انفارمیشن کے ذرائع پر مکمل قبضہ کیا، نہ صرف نصاب کو اور انفارمیشن پالیسی کو اپنی مرضی سے ڈھالا بلکہ پاکستان کے دو بانیوں جناح اور اقبال کی تقاریر، اقوال کو بھی ایڈٹ کیا، روشن خیال اساتذہ، صحافیوں اور دانشوروں پر حتی الامکان روزگار کے دروازے بند کیے، بڑے پیمانے پر اساتذہ پابندِ سلاسل کیا گیا، عقوبت خانوں میں رکھا گیا، صحافیوں کو کوڑے مارے گئے اور اُس زمانے میں کھلم کھلا یہ کہا گیا کہ ہمیں نظریۂ پاکستان کی حفاظت کے لیے پاکستانیوں کی کثیر تعداد کو ہلاک بھی کرنا پڑا تو ہم کرگزریں گے۔ اِسی زمانے میں امریکہ کو ویت نام میں اپنی ہزیمت کا بدلہ روس سے لینے کے لیے افغانستان کے میدان میں ایک ایسا جہاد برپا کرانا پڑا جس میں پاکستانی فوج، اعلیٰ قیادت اور جماعتِ اسلامی نے سب سے زیادہ مفادات حاصل کیے اور یوں مُلّا ملٹری الائنس وجود میں آیا، پاکستان کے اندر تشدد کی نرسریاں ہزاروں کی تعداد میں پروان چڑھیں اور اقبال کے اتحادِ عالمِ اسلام کے تصور کی مسخ شدہ تعبیر پیش کی گئی۔ سرکاری سطح پر اشتیاق حسین قریشی جیسے مورخین کو پذیرائی حاصل ہوئی، انہیں مقتدرہ قومی زبان کا سربراہ بنانے کے لیے اِس ادارے کو تخلیق کرنا پڑا، شریف الدین پیرزادہ، جسٹس جاوید اقبال اور اِسی طرح کے دانشوروں کو سرکاری نظریے اور مقاصد کے پرچار کے لیے مواقع دیئے گئے۔ گویا اسٹیبلشمنٹ کی جانب سے ضیاءالحق دور میں ایسی نظریاتی تعبیر پر اصرار کیا گیا، جس کے مطابق پاکستان کی اساس متشددانہ مذہبی ذہن کے تشکیل کردہ تصورات پر تھی چنانچہ صلوٰۃ کمیٹیاں، زکوٰۃ اور عشر کمیٹیاں بنائی گئیں، سرکاری دفاتر اور تعلیمی اداروں میں ریکارڈ میں درج ہونے والی عبادات کی ادائیگی کے احکامات جاری ہوئے۔ بظاہر یوں دکھائی دیتا تھا کہ ٹینکوں کے مقابل چند سونہتی

آہیں، کچھ شاعروں کے گیت اور چند افسانے یا ڈرامے خوش وقتی اور خوش خیالی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر ضیاء الحق کے گیارہ سالوں میں اُس کے خلاف سیاسی مزاحمت کرنے والوں کو بھی ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی تحریک دینے میں اگر اُردو شاعروں میں دیکھیں تو حبیب جالب اور فیض احمد فیض کی شاعری اور شخصیتوں کی دل آویزی کا بڑا دخل ہے اور افسانے کی دنیا میں منٹو کی تحریروں کی ایک طرح سے بازآفرینی ہوئی، خاص طور پر 'شہید ساز'، 'اللہ کا بڑا فضل ہے'، 'دیکھ کبیرا رویا'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اور کئی افسانے ضیا کے دَورِ ریا میں بھرپور معنوی آگہی اور سرشاری کے ساتھ پڑھے گئے۔ فن کی تفہیم وتحسین میں فن کار کی شخصیت کو مرکزی حوالہ بنانے کے خلاف بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ تخلیقی عمل کے دوران فنکار sublimate کرتا ہے یا رفعت و بالیدگی سے ہم کنار ہوتا ہے اس طرح اس کی رسمی ذات اور تخلیقی وجود کے مابین، تخلیقی لمحات میں فاصلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ یوں اس لمحے کی سچائی کا عکس فنکار کی رسمی ذات میں تلاش کرنا، کارِعبث ہے حالانکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ریاضت تہذیب وتربیت اور اکتساب کے بعد بھی کوئی رسمی ذات، شخصیت کے رتبے پر فائز ہوتی ہے۔ دوسرے تخلیقی عمل کے دوران فن کار جس فکری وحسیاتی بالیدگی اور وجدانی رفعت سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ اس کی شخصیت کا جزو بن جاتی ہے۔ وگرنہ اس میں اور پارسائی کے اس جبے میں کیا فرق رہ جائے گا جو منبر پر جلوہ افروزی کے وقت اوڑھ لیا جائے۔ تیسرے ہر وہ فن کار جو اجتماعی زندگی میں صداقت، حُسن اور نیکی کی روشنی میں پھیلانے کا وعدہ کرتا ہے۔ جو شرف آدمیت، انسان دوستی، سماجی انصاف کی عالم گیری کا خواب دیکھتا اور دکھاتا ہے اور وہ اگر اپنی سماجی زندگی میں ریاکار، کم ظرف، کم حوصلہ اور مردم آزار ہو تو اس کے فن کی اثر پذیری معلوم!

فیض احمد فیض [۱۹۱۱-۱۹۸۴] ہمارے عہد کی ایک عظیم شخصیت تھے، زندگی میں ان کا طرزِ عمل اور رویہ انہی قدروں کا آئینہ دار تھا جن سے ان کا عہدِ وفا استوار تھا۔ شاعروں اور فن کاروں سے ناقدری عالم کا گلا اکثر سننے میں آتا ہے اور اس کا شاید جواز بھی ہے۔ فیض کی جو نظمیں امر ہوگئیں ''نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے'' یا ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' یا ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' تو اِن مصرعوں کو جادوئی بنانے والے اُس کے حقیقی تجربات بھی ہیں۔ وہ ۹/مارچ ۱۹۵۱ء سے ۲۰/اپریل ۱۹۵۵ء تک قید میں رہے، پھر دسمبر ۱۹۵۸ء سے لے کر اپریل ۱۹۵۹ء تک اسیر رہے، ضیاالحق کے زمانے میں اُنہیں سرکاری سطح پر جلاوطن تو نہیں کیا گیا مگر یہ ایک طرح سے اُن کا طویل جلاوطنی ہی کا تجربہ تھا جس نے اُن سے ''دلِ من مسافرِ من'' جیسی نظم تخلیق کرائی۔ فیض نے اسیری میں بے روزگاری میں، کفر اور غداری کے فتووں میں طعن وتشنیع کے ماحول میں جلاوطن کے ایام میں بھی کبھی ناقدری عالم کا گلہ نہیں کیا۔ نہ ڈکٹیٹروں کو طولِ اقتدار کا حوصلہ دینے والی زمین سے جنم لینے پر تاسف کا اظہار کیا، نہ ذرائع ابلاغ اور سرکار دربار سے وابستہ لوگوں کے آنکھیں بدلنے پر ملول ہوئے۔ ان کی شاعری کو دل آویز بنانے میں ان کی رومانوی شخصیت کو بڑا دخل ہے، ان کی پہلی معروف

نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'،اوراس کے اس مصرعے'راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا' کے بارے میں ابھی ایک فیمنسٹ نقاد نے کہا کہ یہ نظم عورتوں اور نسائی کشش کے خلاف ہے، چنانچہ میں ایک مضمون فیض کے خلاف لکھ رہا ہوں، میں نے بڑے ادب سے اسے کہا کہ یہ یاد رکھو ، یہ رشید جہاں نے فیض سے کہا تھا، جس کا اعتراف انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بھی کیا ہے۔

ان کے پہلے شعری مجموعے میں ان کی ایک نظم 'رقیب سے' کے ذریعے ان کا نظریہ یا موقف ہی نہیں، وہ جمالیاتی تجربہ بھی سامنے آتا ہے، جو ملکیتی سماج میں پروان چڑھنے والی محبت کو کشادگیِ فکر و نظر کا وسیلہ بنا دیتا ہے،

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رخِ زرد کے معنی سیکھے

(نسخہ ہائے وفا، ص ۷۰)

اسی طرح، ان کے یہ اشعار غیر جمہوری اور فاشی دور میں مزاحمت کرنے والے طالب علموں، استادوں، صحافیوں اور دانش وروں کے لئے ایک وعدہ، ایک تسلی، ایک خانہ سوز وارفتگی کا جواز بنے رہے ہیں،

گر آج تجھ سے جدا ہیں، تو کل بہم ہوں گے
یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے، طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

(ایضاً، ص ۱۶۳)

رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلّاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

(ص، ۲۸۱)

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو

(ص، ۳۳۳)

ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمعِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہو گا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

(ص، ۶۱۹)

فیض کے بعض معاصرین کے حسد، ترقی پسند تحریک کے مخالفین اور اسٹیبلشمنٹ کے پیش کردہ نظریہ پاکستان کے بعض وکیلوں کے فتویٰ نما تبصروں کے باوجود پاکستانیوں کی اکثریت کو اُن سے والہانہ پیار رہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے صرف غمِ جاناں اور غمِ روزگار کا فرق ہی نہیں سمجھایا بلکہ یہ بھی بتایا کہ غمِ روزگار کو غمِ جاناں بنانے کے لیے کتنی ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ ان لوگوں کا یہ بھی یقین ہے کہ ان کی پوری زندگی انسانوں اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں میں صرف ہوئی، جیل سے ایلس کے نام لکھے گئے خطوط میں سے دو اقتباسات دیکھئے:

''اس اجتماعی دکھ درد کے علاوہ، جو صرف معاشرتی انقلاب ہی سے دُور ہوسکتا ہے، انفرادی رنج و ملال کے ایسے اسباب بھی بہت ہیں، جو تھوڑی سی محبت، شفقت اور سمجھ بوجھ سے اگر دُور نہیں کیے جا سکتے تو کم ضرور کیے جا سکتے ہیں۔' ['صلیبیں مرے دریچے میں' ص ۸۳] قفس میں بلکہ موت کے سائے میں رہ کر بھی فیض کو یقین ہے کہ ''اگر آج کا دن موجود ہے، تو کل کا دن بھی برحق ہے۔ اسی طرح ہر دکھ بھرا دن جو گزرتا ہے، اپنی تسکین اپنے ساتھ لاتا ہے، یہ تسکین لاتا ہے کہ جو دن گزر چکا ہمیشہ کے لیے معدوم ہو چکا اور اس کے بعد جو بھی دن آئے گا، اس سے مختلف ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بہتر ہو، اس لیے

لازم ہے یہی ہے کہ آنے والے دنوں پر نظر جمائے رکھیں اور بیتے دنوں کو جملہ ساکنان عدم کے ساتھ دفن ہو جانے دیں۔'' [ایضاً، ص ۱۲۰]

ڈاکٹر آفتاب نے اپنی کتاب میں فیض کی طرف سے اس اعتراف کا ذکر کیا ہے کہ راشدان سے زیادہ ذہین تھے، پھر انہیں باغی بلکہ ایک منحرف کی شہرت بھی حاصل تھی، مگر فیض کی ثقافتی پذیرائی کو نہتے اور بے وسیلہ لوگوں کی بے بسی کے تناظر میں دیکھنا چاہیئے، جو اپنی محبوب شخصیتوں کو قید و بند سے، جلاوطنی یا عقوبت سے نہیں بچا سکتے، البتہ اس کا کفارہ بڑھی ہوئی والہانہ محبت سے ادا کرتے ہیں۔

حبیب جالب [۱۹۲۸۔۱۹۹۳] نے اپنے ایک انٹرویو میں فیض احمد فیض سے اپنی ایک گفتگو کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ میں نے ان سے کہا 'ہم آپ کے مترجم ہیں' [ظہور احمد، عبدالرحمٰن (مرتب) 'بیسویں صدی کا شاعر' ص ۱۵۰] کیونکہ فیض کے پرستاروں میں پاکستانی اشرافیہ کی بڑی تعداد بھی تھی، جو تعلیم یافتہ اور روشن خیال کہلانے کے شوق میں انہیں پسند کرتی تھی، یا اس کا دعویٰ کرتی تھی، پھر فیض کی ایک ذہنی تربیت سماجی اور تہذیبی زندگی بھی ایسی تھی جس میں اُن کی شعری تراکیب سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص ذہنی سطح کی ضرورت تھی۔ اِس لیے جالب نے جب یہ کہا کہ ہم آپ کے مترجم ہیں تو یہ صرف شعری اظہار کا ماجرا نہیں بلکہ ایک طرزِ زیست کا بیان بھی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جعفر زٹلی، اور نظیر اکبر آبادی کے بعد حبیب جالب ہی اردو کا وہ شاعر ہے جو عوامی شاعر کہلا سکتا ہے۔ اس نے نہ صرف ہر دور میں قید و بند کی صعوبت برداشت کی، بلکہ ایوبی آمریت کے زمانے میں اس نے فاطمہ جناح کے ساتھ لاکھوں لوگوں کے جلسوں میں اپنی دو معروف نظمیں سنائیں، 'دستور' اور 'بیس گھرانے' اور سماجی تبدیلی کے آرزومند غریب اور بے وسیلہ لوگوں کے وہ دل کی آواز اور دھڑکن بن گئے۔ ایوب خان نے اپنے اقتدار کو دائمی بنانے اور حسبِ منشا حکومت کرنے کے لئے ۱۹۶۲ء کا جو دستور بنایا تھا، اس کے خلاف شاعری میں جب یہ آواز بلند ہوئی، تو پھر یہ پاکستان کر ہر گلی کوچے میں گونجنے لگی۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو، صبحِ بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا
پھول شاخوں پہ کھلنے لگے تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے تم کہو
اس کھلے جھوٹ کو ذہن کی لوٹ کو

میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا
['حرفِ حق'، دانیال، ۱۹۸۳ء، ص ۲۳، ۲۴]

بیس گھرانے ہیں آباد۔۔اور کروڑوں ہیں ناشاد
صدر ایوب، زندہ باد
بیس روپیہ من آٹا۔۔۔اس پر بھی ہے سناٹا
گوہر، سہگل، آدم جی۔۔۔بنے ہیں برلا اور ٹاٹا
ملک کے دشمن کہلاتے ہیں۔۔جب ہم کرتے ہیں فریاد
['حرفِ حق' ص ۳۲، ۳۳]

اِسی طرح ضیاء الحق کے مضحکہ خیز ریفرنڈم پر بھی ابھی جالب کی نظم ''صدائے کوچہ و بازار'' بن گئی۔ اِس ریفرنڈم میں لوگوں سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا آپ اِسلام نظام چاہتے ہیں اور ہاں کا مطلب یہ تھا کہ ضیاء الحق پانچ سال اور مسلط رہیں گے۔ نوے فیصد مسلمان باشندوں کے اِس ملک میں سرکاری نظریہ پاکستان کی بے بسی اِس ریفرینڈم کے روز ظاہر ہوئی جب ایسے جواب کے لیے بھی بڑے پیمانے پر جعلی ووٹوں کا اہتمام کرنا پڑا اور پھر ضیاء الحق کے طویل دور کے خاتمے پر ۱۹۸۸ء میں قائم ہونے والی نیم جمہوری حکومت میں بھی جب نظام کی تبدیلی کے حوالے سے طویل عرصے تک جدوجہد کرنے والے لوگوں کو مایوسی ہوئی تو اُن کی افسردگی اور تلخی کو حبیب جالب نے زبان دی۔

وہی حالات ہیں فقیروں کے
دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے
(حبیب جالب، بیسوی صدی کا عوامی شاعر، ص ۱۸۷)

وہ سعادت حسن منٹو [۱۹۱۲۔۱۹۵۵]، جسے ریڈیو پاکستان پر بین کر دیا گیا تھا، اپنی تحریروں میں کئی مقدمات کا سامنا کر چکا تھا اور دو مرتبہ ذہنی شفاخانے میں زیرِ علاج رہ چکا تھا اور مرتے وقت دوائی پلانے پر مصر اپنی بیوی سے روشنی اور روشنی جیسے کلمات ادا کرنے کی بجائے کہا تھا اَب یہ ذلت اَب ختم ہو جانی چاہیے۔ اُسی منٹو کی پچاسویں برسی پاکستان میں سرکاری اداروں اور جامعات میں منائی گئی، یادگاری لیکچر ہوئے۔ پاکستان میں عوامی شعور کے مظہر، تھیٹر اجوکا نے منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگ کی ڈرامائی

تشکیل پیش کی اور حیران کن بات یہ ہے کہ مزدور انجمنوں نے منٹو کو یاد کیا اور اُن کے ایک نمائندہ جریدے نے منٹو نمبر شائع کیا۔ پروفیسر فتح محمد ملک کی نئی کتاب ''سعادت حسن منٹو، ایک نئی تعبیر'' (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء) سے یہ بحث بھی چھڑی ہے کہ کیا منٹو ایک نمائندہ پاکستانی تخلیق کار ہے۔

کیونکہ ایک عرصہ تک کسی کو پاکستانی قرار دینے کے اختیارات اُس ٹولے کے پاس تھے جو اُن کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتا ہو اور ہو سکے تو شعر و ادب بھی تخلیق نہ کر سکتا ہو۔ سو، اگر تو پاکستانی سے کسی کی مراد ایک ایسا شخص ہے جو بھارت کو عالمِ اسلام کی مدد سے تہس نہس کرنا چاہتا ہے تو منٹو پاکستانی نہیں تھا اور اگر پاکستانی تخلیق کار سے وہ شخص مراد ہے جو طاقتوروں کی تاریخ، تہذیب اور فکر پر اجارہ داری اور قومی شناخت کی من چاہی تشریح کے مقابل اپنے تخلیقی ضمیر کی روشنی میں حقِ انحراف استعمال کرتا ہے تو پھر بلاشبہ منٹو سے بڑا کوئی پاکستانی تخلیق کار نہیں تھا۔ منٹو کے بارے میں کم و بیش طے ہے کہ وہ مذہبی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کا ہم نوا نہیں تھا، پاکستان کی حکمران جماعت کی ہوسِ اقتدار اور محلاتی سازشوں کا شاکی تھا۔ 'مفتیانِ کرام' کا قطعاً احترام نہ رکھتا تھا۔ انتظامیہ اور مقتدر طبقات کی انا اور منشاء کو قانون سمجھ کر آنکھیں نہیں جھکاتا تھا۔ منٹو نے اپنے ایک مضمون 'محبوس عورتیں' میں قیامِ پاکستان کو برطانوی سامراج کی حکمتِ عملی کا ایک حصہ قرار دیا۔ اسی طرح اس نے ایک اور مضمون ''ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ'' میں لکھا تھا۔ یہ لیڈر جب آنسو بہا بہا کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ مذہب خطرے میں ہے تو اس میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ مذہب ایسی چیز ہے ہی نہیں کہ خطرے میں پڑ سکے''۔ (منٹو کے مضامین، ص ۸۴)

مگر قیامِ پاکستان کے بعد منٹو نے لکھا ''ملک کے بٹوارے سے جو انقلاب برپا ہوا، اس سے میں ایک عرصہ تک باغی رہا اور اب میں بھی ہوں۔ لیکن بعد میں اس خوفناک حقیقت کو میں نے تسلیم کر لیا''۔ (جیب کفن۔ یزید۔ ص ۲۰۱) ____ اپنے جس مضمون میں منٹو نے قیامِ پاکستان کو انگریزوں کا مرہونِ منت قرار دیا۔ اس میں بڑی دردمندی کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا ____ ''ہماری بٹی ہوئی تہذیب، ہمارا تقسیم شدہ تمدن، ہمارا نچا ہوا فن، ہر وہ چیز جو ہمارے ہی جسم سے کٹ کر ہمیں ملی ہے۔ مغربی سیاست کے بھوبل میں دفن ہے ہمیں ان سب کو نکالنا ہے۔ جھاڑ نا پونچھنا ہے تر و تازگی بخشنا ہے اور اس طوفان میں جس جس شے سے ہم محروم ہوئے ہیں اسے دوبارہ حاصل کرنا ہے لیکن سب سے پہلے ہمیں ان زخموں کی دیکھ بھال کرنا ہے جو ذرا سی غفلت پر ناسور بن جانے والے ہیں'' (تلخ، ترش اور شیریں، ص ۸۱، ۸۲)

منٹو نے اس نقطۂ نظر کا 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' میں کھل کر اظہار کیا ہے، تقسیمِ ہند کے موقع کی 'دیوانگی' اور 'جذباتیت' کو مدِنظر رکھیں تو پاگل خانے کا منظر نامہ بے پناہ معنویت کا حامل نظر آتا ہے۔ ''اور جب تبادلہ ہونے لگا تو سرحد پر سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ ادھر اُدھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا۔ اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا ____ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان

میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔'' (ص ۲۰)

مگر بعض 'ترقی پسندوں' کے برعکس منٹو کو احساس تھا کہ ہندو مسلم عقائد کے اعتبار سے ہی نہیں مزاج کے اعتبار سے بھی دو قومیں ہیں۔ اگرچہ اس احساس کا بنیادی سبب 'عقیدہ' ہے جسے ترک کرنا منٹو کے رومانوی کردار بھی پسند نہیں کرتے ____ 'دو قومیں' کا اختتامی حصہ توجہ سے دیکھئے، تو دلیل نہیں تو مثال مل جائے گی۔

یہ درست ہے کہ منٹو برصغیر کی دونوں قوموں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کرنے کا خواہش مند نہیں تھا۔ چنانچہ جب ۱۹۴۸ء میں کشمیر کی جنگ شروع ہوئی تو منٹو نے دونوں متحارب فوجیوں کی مشترکہ یادوں، امنگوں، ورثے اور ماضی کے حوالے سے یہ تین کہانیاں لکھیں 'آخری سیلوٹ'، 'جھوٹی کہانی' اور 'ٹیٹوال کا کتا' (یزید) ____ مگر سیکولر اور جمہوری بھارت کا ایک روپ منٹو کے روبرو اس وقت آتا ہے۔ جب پاکستان کے لوگوں کو بھوکا مارنے کی خاطر دریاؤں کے رخ موڑنے کی باتیں ہوتی ہیں پانی بند کرنے کی دھمکیاں ہی نہیں دی جاتیں۔ عملی اقدامات بھی کئے جاتے ہیں۔ اس وقت سعادت حسن منٹو 'یزید' ایسا افسانہ لکھتا ہے ____ جس کے مرکزی کردار کریم داد کے سامنے ایک جذباتی شخص پانی بند کرنے والے یزیدوں کو گالیاں دینا شروع کرتا ہے تو کریم داد چیخ کر کہتا ہے ''گالی نہ دے چوہدری کسی کو'' وہ بڑے تیکھے لہجے میں پوچھتا ہے کہ کیا لگتے ہیں وہ تمہارے؟.... تو کریم داد بڑے تحمل سے جواب دیتا ہے میرے کیا لگتے ہیں؟ میرے دشمن لگتے ہیں..... وہ پانی بند کر کے تمہاری زمینیں بنجر بنانا چاہتے ہیں اور تم انہیں گالی دے کر یہ سمجھتے ہو کہ حساب بے باق ہوا'' اور پھر کریم داد دشمن سے نمٹنے کے لئے ایک عجیب حربہ اختیار کرتا ہے۔ اس کا پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کا نام 'یزید' رکھ دیتا ہے۔ مگر اس اعتماد کے ساتھ ''اس نے دریا کا پانی بند کیا تھا یہ کھولے گا!'' (ص ۲۱) اِن دو ملکوں کے بیچ پانی کے تنازع میں منٹو کے اِس افسانوی یزید کو انسانی ضمیر کے مطابق ابھی مؤثر ہونا ہے۔

پاکستان میں شخصی حکومتوں کی وجہ سے ریاکاری ایک طرح کا نظریاتی حوالہ بن گئی جبکہ منٹو جبر و ظلم، استحصال، غلامی، تنگ نظری اور ریاکاری سے عمر بھر نبرد آزما رہا ____ منٹو کی تلخی میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ جب 'انجام بخیر' (رتی، ماشہ اور تولہ) کی تائب طوائف کو پاکستان میں پیشوا ز پہن کے، پاؤں میں گھنگرو باندھ کے بزم آرائی کرنی پڑتی ہے ____ جب ابو کو چوان کی یتیم بیٹی نیتی کو تانگہ چلانے کا لائسنس تو نہیں ملتا۔ البتہ پاکستان کے ایک چکلے میں بیٹھنے کا لائسنس مل جاتا ہے ('لائسنس' ____ خالی بوتلیں، خالی ڈبے) ____ جب پھگو بھنگی دو دن کی بھوک سے مجبور ہو کر کریم درزی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ساڑھے تین آنے نکال لیتا ہے (حالانکہ وہ درزی اس کا پانچ روپے کا مقروض تھا) تو پاکستانی عدالت اسے ایک برس کے لئے جیل بھیج دیتی ہے ____ ''اگر کوئی خدا ہے تو میری اس سے درخواست ہے کہ خدا کے لئے تم یہ انسانوں کے قوانین توڑ دو، ان کی بنائی ہوئی جیلیں ڈھا دو اور آسمانوں پر اپنی جیلیں

خود بناؤ خود اپنی عدالت میں ان کو سزا دو، کیونکہ اور کچھ نہیں تو کم از کم خدا تو ہو'۔ ('ساڑھے تین آنے'۔ ٹھنڈا گوشت، ص ۱۳۴) ___ جب بھوک کا علاج کئے بغیر گداگروں کی گرفتاری کی مہم شروع ہوتی ہے، جب ایک ایم اے، ایل ایل۔ بی کو دو سو کھڈیاں الاٹ ہوتی ہیں اور وہ دھاگے کا کوٹا بیچ دیتا ہے۔ کھڈیوں کو استعمال میں لاتا ہی نہیں، جب ایک پاکستانی کہتا ہے، جس کا نام سورداس ہو وہ بھگت ہو ہی نہیں سکتا، جب ایک جرنیل یہ تقریر کرتا ہے ''اناج کم ہے، کوئی پروا نہیں، فصلیں تباہ ہوگئی ہیں کوئی فکر نہیں ___ ہمارے سپاہی دشمن سے بھوکے ہی لڑیں گے جب قائداعظم کے پاکستان میں ایک دکان پر یہ بورڈ لگتا ہے 'جناح بوٹ ہاؤس' جب قائد کا سوگ بازوؤں پر سیاہ بلے باندھ کر منانے والوں سے کہا جاتا ہے یہ کالے رنگ کی چندیاں اگر جمع کر لی جائیں تو سینکڑوں کی ستر پوشی کر سکتی ہیں۔ تو سیاہ بلے والے اسے یہ کہہ کر پیٹنا شروع کر دیتے ہیں ''تم کمیونسٹ ہو، ففتھ کالمسٹ ہو پاکستان کے غدار ہو'' (اسے ۶ تک یہ تمام ٹکڑے ...'دیکھ کبیرا رویا' ___ نمرود کی خدائی سے ماخوذ ہیں) ___ جب کم علم مولوی صاحبان کے فیض سے پاکستان کی سب سے بڑی صنعت 'شہید سازی' بن جاتی ہے ''آج کل میں ایک بہت بڑی عمارت بنوا رہا ہوں۔ ٹھیکہ میری ہی کمپنی کے پاس ہے، دو لاکھ کا ہے اس میں سے ۷۵ ہزار تو میں صاف اپنی جیب میں ڈال لوں گا، بیمہ بھی کرا لیا ہے، میرا اندازہ ہے کہ جب تیسری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ اڑاڑ دھڑام گر پڑے گی۔ کیونکہ مسالا ہی میں نے ایسا لگوایا ہے اس وقت تین سو مزدور کام پر لگے ہوں گے، خدا کے گھر سے مجھے پوری پوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی بچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ پرلے درجے کا گناہگار ہے جس کی شہادت اللہ تبارک تعالیٰ کو منظور نہیں تھی'' ('شہید ساز'۔ نمرود کی خدائی، ص ۱۳۹)

جب 'صاحب کرامات' (سڑک کے کنارے) موجو کی بیوی اور بیٹی کی عصمت کے عوض اپنی داڑھی اور پٹے بستر پر چھوڑ جاتا ہے اور سادہ لوح موجو کہتا ہے ''جاؤ ان کو کسی صاف کپڑے میں لپیٹ کر بڑے صندوق میں رکھ دو ___ خدا کے حکم سے گھر میں برکت ہی برکت رہے گی'' ___ (سڑک کے کنارے، ص ۱۹۹) ___ جب ان ناانصافیوں اور تضادات کو دیکھ کر گڈریئے کا معصوم بیٹا دہائی دیتا ہے ''شیر آیا، شیر آیا، دوڑنا، تو اسے کہا جاتا ہے 'تم سازشی ہو، ففتھ کالمسٹ ہو کمیونسٹ ہو، غدار ہو، ترقی پسند ہو، سعادت حسن منٹو ہو' یہ فتویٰ دیا جاتا ہے 'یہ ملحد ہے یہ بے دین ہے، فتنہ پردازوں کا ایجنٹ ہے، اس کو فوراً زنداں میں ڈال دو'' (شیر آیا، شیر آیا، دوڑنا، نمرود کی خدائی، ص ۱۰۶، ۱۰۸)

جب صادق خان کو صوبہ بدر کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ بڑا انقلاب چاہتا تھا، جو ظلم و ستم کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے وہ چاہتا تھا کہ سرمائے کی لعنت سے دنیا آزاد ہو جائے۔ دنیا آزاد نہ ہو تو کم از کم اس کا صوبہ آزاد ہو جائے ('نظفہ' ___ سڑک کے کنارے، ص ۶۵) ___ مگر منٹو کی تلخی مردم آزاری یا مردم بیزار شخص کی تلخی نہیں، کلبیت سے ہم رنگ نہیں اسے اپنی بستی کے لوگوں سے مکالمہ بہر

طور کرنا ہے، اس لئے وہ مسکراہٹ سے کام لے کر ہمیں اس حلوائی سے متعارف کراتا ہے جو پاکستان کے پہلے 'یوم آزادی' پر خود تو پسینے میں تر ہے۔ مگر پنکھے کا رخ قائداعظم کی تصویر کی جانب کر کے بیٹھا ہے ('سویرے جو کل آنکھ میری کھلی' ___ تلخ، ترش اور شیریں، ص ۶۶) ___ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کے بیشتر لیڈروں اور بیشتر ورکروں نے پاکستان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ قومی تاریخ کا دردناک باب ہے ناجائز الاٹمنٹیں، روٹ پرمٹ، امپورٹ لائسنس تو خیر ہوئے ہی، بدترین فسطائیت اور آمریت بھی حُب وطن کی اجارہ داری کے زعم میں نافذ کرنے کی کوشش کی گئی ___ 'لیڈر بن جائیں' ___ صرف مسلم لیگ کے ___ 'جی ہاں میرا مطلب یہی تھا کہ کسی اور لیڈر کا رہنا فحش ہے' ___ 'بے حد فحش' ('پس منظر' ___ اوپر نیچے اور درمیان، ص ۱۴) ___ فحاشی کے خاتمے کے نام پر پاکستان کے سوشل اور کلچرل وجود کو مٹانے کی کوشش کی جاتی تو شاید منٹو خاموش رہتا، مگر اس پر اللہ کا شکر بھی ادا کیا جاتا ہے۔

منٹو کے قلم کا زور اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ چچا سام کے نام خط لکھتا ہے آپ انہیں افسانے قرار نہ دیں لیکن یہ تو دیکھئے کہ منٹو اور پاکستان کے اس وزیراعظم کے درمیان کتنا فاصلہ ہے جس نے اس جلوس کی قیادت کی۔ جس میں اونٹوں کے گلوں میں تختیاں آویزاں تھیں 'اے امریکہ تیرا شکریہ!' ___ پھر عالمی سیاسیات کے تناظر میں 'بی زمانی بیگم' کو دیکھئے، بے حد موثر سیاسی طنزیہ ہے۔

منٹو پر اردو میں لکھی جانے والی ساری تنقید پڑھ جایئے۔ مگر منٹو کے مرنے پر بلقیس عابد علی کا جو مختصر مضمون 'گل خنداں' کے منٹو نمبر میں شائع ہوا، اس میں جس طریقے سے منٹو کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ بے شک منٹو ایسے سچے فن کار کو اپنی بستی کے لوگوں سے ایسا ہی نذرانہ ملنا چاہئے تھا ___ ''منٹو زندہ تھا تو عوام کو امید تھی کہ جب بھی کہیں کوئی ناانصافی ہوگی۔ منٹو کے نوٹس میں آجائے گی اور پھر وہ سماج کو، عوام کو، حکومت کو مجبور کرے گا کہ اس حقیقت کے گھناؤنے گوشے کو کم از کم جھانک کر دیکھ لے'' ('منٹو مر گیا' ___ گل خنداں، منٹو نمبر، ص ۶۵)

منٹو نے ''ماتمی جلسہ'' کے نام سے جو افسانہ لکھا وہ اُنہیں ضرور پڑھنا چاہیے جو نظریۂ پاکستان کی ایک جذباتی تعبیر سے منٹو کو ہم نوا دیکھنا چاہتے ہیں۔

''اس نے دین کو جب علم سے علیحدہ کیا تو بہت سے قدامت پسندوں نے اس کی مخالفت کی مگر وہ سرِ بازار پھانسی پر لٹکا دیئے گئے اس نے جب یہ فرمان جاری کیا کہ کوئی ترک روسی ٹوپی نہ پہنے تو بہت سے جاہل لوگوں نے اسکے خلاف آواز اٹھانا چاہی مگر یہ آواز ان کے گلے ہی میں دبا دی گئی اس نے جب یہ حکم دیا کہ اذان ترکی زبان میں ہو تو بہت سے ملاؤں نے عدول حکمی کی مگر وہ قتل کر دیئے گئے' ___ 'یہ کفر بکتا ہے'.....'یہ کافر ہے جھوٹ بولتا ہے' کے نعروں میں مقرر کی آواز گم ہوگئی.....اس کے ماتھے پر ایک پتھر لگا اور وہ چکرا کر اسٹیج پر گر پڑا'' (ص ۱۰۴، ۱۰۵)

''دیوالی کے دیئے'' میں ایک مونتاژ کی طرح غیر مرتب تصویروں سے طبقاتی کشاکش کا نقشہ

کھینچا گیا ہے، جو اپنے اجتماعی گرد و پیش کے ساتھ تخلیق کار کی وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔

''دنیا میں اتنے مصلح پیدا ہوئے ہیں، ان کی تعلیم تو لوگ بھول چکے ہیں، لیکن صلیبیں، دھاگے ،داڑھیاں، کڑے اور بغلوں کے بال رہ گئے ہیں۔'' (''سوراج کے لیے''، ص ۴۶، ۴۷)

فاطمہ جناح، بے نظیر بھٹو، عاصمہ جہانگیر اور ویمن ایکشن فورم کی سیاسی اور قانونی جدوجہد نے پاکستانی معاشرے میں عورت کے حوالے سے جہاں کچھ فتویٰ فروشوں کو پسپا کیا وہاں عورت کے حقوق اور اُس کی توقیر کے حوالے سے بعض تعصّبات کو بھی معتدل بنایا یا ان کا ڈنگ نکالا۔ اِسی تناظر میں بظاہر ملامتی پیرائے میں مزاحمتی اظہار کرنے والی خواتین تخلیق کاروں نے نہ صرف اپنی نظم ونثر کا اعتبار پیدا کیا بلکہ اُردو تنقید میں نسائیت کے حوالے سے ردِ تشکیل کی بعض ایسی کاوشیں بھی کیں، جن کے بعد قارئین کو یہ موقف بھی قابلِ توجہ سمجھنا پڑا کہ مردانہ تعصّبات یا ملکیتی سماج میں مرد کی برتری پر قائم معاشرے میں اردو داستانوں میں عورت کی بے وفائی یا دوسری اصناف میں اس کی ایک خاص طرح کی پیکر تراشی کو نفسیاتِ انسانی کا آخری اور حتمی حوالہ خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور زاہدہ حنا کی تخلیقی، فکری اور عملی کاوشیں مرد کی فوقیت پر قائم معاشرے کے بہت سے تصورات کو متزلزل کر رہی ہیں۔ اِسی طرح اُردو کے علاوہ سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، پنجابی یا دیگر زبانوں میں تخلیق کار، شرف آدمیت اور اپنی شناخت کے ساتھ ساتھ حقوق کی بات کرتے تھے اور اُنہیں ریاست کا وفادار خیال نہیں کیا جاتا تھا تو اَب اُردو اور اِن زبانوں کی تخلیقی دنیا کی فضا میں ایک ربط سا پیدا ہو رہا ہے۔ ضیاء الحق کے جہاز گرنے [۱۷ اگست ۱۹۸۸ء] کے بعد فوج میں ان کے جانشین مرزا اسلم بیگ کی جانب بہت سی انگلیاں سازش کے مرکزی کردار کے طور پر اٹھ رہی تھیں، اس لئے ایسی حکمتِ عملی اختیار کی گئی کی مختصر عرصے کے لئے کچھ سیاسی مرغانِ دست آموز کو محدود اختیارات کے ساتھ اقتدار بظاہر منتقل کر دیا جائے، پھر ان سے ایک دوسرے کی کردار کشی کرا کے سیاسی منظر سے ہٹا کر تمام حجابات اٹھا کر فوج اقتدار پھر سے سنبھال لے، تاکہ کم از کم ایک بات تو ثابت ہو سکے کہ پاکستان مردان آہن کی تخلیق کے سلسلے میں خود کفیل ہے۔ یوں جنرل مشرف ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں برسرِ اقتدار آ گئے، ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعے کے بعد بظاہر اسٹیبلشمنٹ کی نظریاتی سمت اور تعبیر میں ایک تبدیلی آئی ہے، کشمیر، افغانستان، چیچنیا اور دیگر خطوں میں مصروفِ جہاد عسکری تنظیموں میں ربط پیدا کرنے والے عسکری ہاتھ یا بازو کو ذرا ماندگی کا وقفہ دیا گیا، پاکستان کے سافٹ امیج یا اعتدال پسند اور متحمل تصور کو ابھارنے کی کوشش ہوئی، خواتین کی نیابت یا نمائندگی کے حوالے سے بھی کچھ مثبت اقدامات ہوئے، مگر جنرل مشرف کا اصل مخمصہ یہ ہے کہ وہ بظاہر ضیاء الحق سے مختلف تعبیرات رکھنے والے کے طور پر اپنی پہچان چاہتے ہیں، جبکہ ان کی قوت کا انحصار ان کی وردی پر ہے یا پھر ضیاء الحق دور کی تیار کردہ سیاسی نرسری پر اور سب سے بڑی بات جو پاکستانی مقتدرہ اب تک نہیں سمجھ سکی کہ احساسِ شرکت کے بغیر احساسِ یگانگت پیدا نہیں ہو سکتا، اس لئے بے گانگی یا لاتعلقی

پاکستانی معاشرے میں سرایت کر گئی ہے، دوسرے اب یہ بات بھی حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے کہ جب تک بھارت کے ساتھ پاکستان کے تعلقات بہتر نہیں ہوں گے، اس وقت تک پاکستان میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط تو درکنار، زمین میں جگہ ہی نہیں بنا سکتیں، مگر خواہشوں اور تمناؤں کے ذریعے تاریخ کے دھارے کو بدلا نہیں جا سکتا، آخر تقسیمِ ہند پر منتج ہونے والے اسباب میں اس عامل کا ایک کردار تو ہے، جو ہندو قیادت [ہندوستانی قیادت؟] کی مطلوب سے کم کشادہ دلی کے سبب برصغیر کی دو بڑی قوموں کے مابین فاصلے کو متشددانہ بناتا رہا ہے، تاہم، کرشن، بیدی، عصمت، امرتا پریتم اور ندیم کے بعد اب بھی اردو کے ادبی افق پر، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، مشتاق احمد یوسفی، امر جلیل، شوکت صدیقی اور احمد فراز موجود ہیں، جن کے سبب کشیدہ سرحد کے باوجود، دونوں طرف کے انسانوں کو امن، رواداری اور شرفِ آدمیت جیسی اقدار کو تہذیبی اور ادبی ورثہ سمجھنے پر تیار کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

فرح ذبیح

مُسلم نشاۃ الثانیہ کی نقیب ___ علی گڑھ تحریک

علی گڑھ تحریک کا نام سُنتے ہی جو تصویر ہمارے ذہن میں سب سے پہلے اُبھرتی ہے وہ سرسید احمد خان کی ہے۔ جن پر نظامِ شمسی کی مثال منطبق آتی ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر علی گڑھ تحریک سے پہلے ہندوستان کے حالات کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔

بلاشبہ انگریزوں کی آمد سے مسلمانوں کے اقتدار کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد اگرچہ مغلیہ سلطنت ۱۸۵۷ء تک قائم رہی مگر پورے کا پورا ہندوستان ہنگاموں کی آماجگاہ بنا رہا اور مسلمانوں کی سیاسی گرفت کمزور ہوتی چلی گئی۔ بالخصوص نادر شاہ ایرانی، احمد شاہ ابدالی، جاٹوں، مرہٹوں اور روہیلوں کے حملوں نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ مغل سلطنت کے آخری تاجدار جو صرف نام کے بادشاہ تھے۔ انگریزوں نے اُنہیں تمام اختیارات سے محروم کر رکھا تھا اور مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشی، اقتصادی غرض ہر حیثیت سے پامال کیا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ آپس کی خانہ جنگیوں نے اُنہیں مزید کمزور تر کر دیا تھا۔ بقول میر

شہاں کہ کُحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہیں کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اِن تمام حالات کا سبب مسلمانوں کی عیش کوشی و سہل پسندی تھی یا انتظامی صلاحیت کی کمی اس پر سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "Our Indian Muslims" (ہمارے ہندوستانی مسلمان) میں مسلمانوں کی حکومت سے بددلی کی چار وجوہات پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

> ''مسلمانوں کو حکومت سے بہت سی شکایات ہیں۔ ایک شکایت یہ ہے کہ حکومت نے اِن کے لیے عہدوں کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ دوسرے ایک ایسا طریقۂ تعلیم جاری کیا ہے جس میں اِن کی قوم کے لیے کوئی انتظام نہیں۔ تیسرے قاضیوں کی موقوفی نے ہزاروں خاندانوں جو فقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے بیکار اور محتاج کر دیا ہے۔ چوتھی شکایت یہ ہے کہ ان کے اوقاف کی آمدنی جو اُن کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہیے تھی غلط مصرفوں پر خرچ ہو رہی ہے۔''[۱]

مسلمانوں کی اقتصادی حالت کا یہی نقشہ بنگال سے لے کر ہندوستان تک محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ہندو چالاک ثابت ہوا تھا۔ اپنی چالاکی کے باعث سرکاری ملازمتوں کے حصول میں اپنی تعلیمی

قابلیت کی بنیاد پر بازی لے گیا جبکہ مسلمانوں کی تعداد صفر تھی۔ یہ وہ مسلمان تھے جو ماضی میں تمام قوموں سے زیادہ بہادر، قوی، توانا، سیاسی اور انتظامی حیثیت کھو چکے تھے[۲]۔ اپنا کھویا ہوا مقام و مرتبہ حاصل کرنے کے لیے قوت کا استعمال کیا گیا اور مذہبی بے راہ روی کو دُور کرنے کی کوشش زور پکڑ گئیں۔ اس نازک وقت میں شاہ ولی اللہ جہادِ عمل میں اُترے اور بلاتخصیص ہر طبقے کی اصلاح کا بیڑا اُٹھاتے ہوئے طلباء، علماء اور عوام الناس کو پیغمبرِ اسلام کی لائی ہوئی کتاب کا اتباع کرنے اور سنت پر عمل کی ہدایت کی۔ ملتِ اسلامیہ کی بقاء اِسی میں ہے۔ بقول اقبال

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہے تقدیریں

شاہ ولی اللہ نے برِعظیم میں جس جہاد کی تگ و دَو کی اس کے نتیجے میں تحریکِ مجاہدین نے جنم لیا جس کا مقدر اسلامی ریاست کا قیام و استحکام تھا۔ گو کہ انگریزوں اور سکھوں نے اس تحریک کو ناکام کر دیا مگر اس تحریک سے کئی اور تحریکیں پھوٹتی چلی گئیں۔ اس اصلاحی کام کو فرائضی تحریک کے نام سے حاجی شریعت اللہ نے جاری رکھا اور مزید وسعت سید احمد شہید نے دی۔ اُنہوں نے احیائے دین اور مسلم حکومت کے تحفظ کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ احمد شاہ ابدالی، مرہٹوں، روہیلوں کے حملے، پانی پت کی معرکہ آرائی، معرکہ آکوڑہ، معرکہ بالاکوٹ کے باوجود مغلیہ سلطنت نہ سنبھل سکی۔ بقول عابد حسین:

> ''سولہویں صدی میں مغل حکومت کے قیام سے لے کر اٹھارویں صدی میں نادر شاہ کے حملے تک یعنی دو صدیوں سے زیادہ تک ہندوستان بیرونی مداخلت سے محفوظ رہا۔ پھر اندرونی انتشار بھی شروع ہوا اور بیرونی حملے بھی۔ جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ حکومت کمزور ہو رہی ہے۔[۳]

بقول اقبال:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

اِن نامساعد حالات میں سرسید احمد خان کی نظر بدلتے ہوئے حالات اور نئے دُور کے نئے تقاضوں کو بھانپ گئی تھی۔ مسلمانوں کی ذہنی، مذہبی، اقتصادی سیاسی اور معاشی پستی کی اصلاح کے لیے تعلیم کو ضروری قرار دیا۔ نئے تقاضوں کے ساتھ چلنے کے لیے ضروری تھا کہ انگریزی تعلیم حاصل کی جائے مگر مسلمان اس سے بدکتے تھے۔ سرسید کا نقطۂ نظر اس لیے بھی درست تھا کہ اب تک مسلمانوں کی ادبی زبان فارسی تھی۔ جس کا وجود نئے دور میں بے معنی تھا رہی بات اردو کی تو اس میں قابلِ قدر سرمایہ نہ تھا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد فورٹ ولیم کالج کی بدولت اردو ادب میں جو اضافہ ہوا اس میں ہندوستان کی تہذیب و روایت سے شناسائی اور سیاسی مصلحتوں کا عمل دخل زیادہ تھا۔ دوسرے اردو شاعری میں گل و بلبل

کی داستان، ناول اور داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر کا ظہور سب سے بڑھ کر زبان کے مقفع و مسجع روڑے ایسے نقائص تھے جو قوم کی نشوونما میں کارآمد ثابت نہ ہو سکتے تھے۔ مثلاً میر امّن کی ''باغ و بہار'' (قصہ)، حیدر بخش حیدری کا قصہ ''مہر و ماہ''، قصہ لیلیٰ مجنوں (یہ امیر خسرو کی فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ) ہفت پیکر (یہ نظامی گنجوی کی مثنوی کا ترجمہ ہے)، گلدستۂ حیدری (حیدری کے متفرق مضامین، حکایات و لطائف، دیباچے، غزلیات و قصائد ہیں)، میر شیر علی افسوس کی آرائشِ محفل، مظہر علی ولا کی تالیف مادھونل او رکام کندلا (یہ قدیم ہندی زبان کے ایک قصہ کا ترجمہ ہے)، للولال کوی کی پریم ساگر (بھگوت گیتا کے دسویں باب کا ترجمہ)، کاظم علی خان کا ڈرامہ شکنتلا کا اردو ترجمہ، خلیل علی خان آشک کی داستان، امیر حمزہ، نہال چند لاہور کی مذہب، عشق، رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب (داستان)، مرزا علی لطف کی تذکرۂ گلشنِ ہند۔ یہ سارا ادب فارسی اور مشکل عبارت کے نرغے سے نہ نکل سکا۔ بے شک فورٹ ولیم کے اہتمام سے جتنا ادب تخلیق ہوا وہ اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا مگر جدید تقاضوں کے ساتھ قدم نہ ملا سکتا تھا۔ سیاسی حالات کے پیشِ نظر ضرورت ایسے ادب کی تھی جس میں زندگی کے مسائل کا بیان ہو سکے جو مسلمانوں کی ترغیب کر سکے۔ شاعری ہو یا نثر اِن میں زندگی کے مسائل کا بیان ہی قوم کو جگا سکتا تھا۔ شیخ اکرام لکھتے ہیں:

> ''قوم کی اصلاح کے لیے ضروری تھا کہ ایک نئی زبان تیار ہو جو فارسی کی جگہ لے لے۔ ایک نیا لٹریچر پیدا ہو جو شاندار ماضی اور موجودہ زبوں حالی کی تصویر قوم کے سامنے کھینچ کر رکھ دے۔ شاعری اور شاعرانہ تنقید کے نئے اُصول مرتب ہوں۔ ایک نئی نثر رائج ہو جو زورِ انشاء دکھانے کے لیے نہیں بلکہ عام روزمرہ کے واقعات بیان کرنے کے لیے کام آئے۔ علی گڑھ تحریک نے یہ سب کچھ کیا۔''[۴]

اور سچ تو یہ ہے کہ سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم کا جو بیڑا اُٹھایا وہی دَورِ اردو ادب کا شاندار دور ہے گو کہ اِس تحریک سے وابستہ بے شمار مشاہیرِ ادب تھے جنہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی و سیاسی اصلاح کے لیے تن مَن دھن کی بازی لگا دی تھی۔ سرسید کے اِس نظامِ شمسی میں میں قابلِ ذکر اردو ادب کے عناصر خمسہ حالی، شبلی، نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، سرسید خود اس کے علاوہ وقار الملک، محسن الملک، اعظم یار جنگ ہیں جو کہ اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ انہوں نے اردو ادب میں نئی اصناف کو متعارف کرایا اور ادب کا تعلق زندگی سے جوڑا۔ اقبال نے یوں ہی تو نہیں کہا

ہر ایک مقام سے آگے نکل گیا مہ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دَو

بقول ڈاکٹر سید عابد حسین:

> ''مسلمانوں میں زندگی کی نئی رُو سرسید احمد خان اور ان کے مٹھی بھر ساتھیوں کی اُپج سے اُٹھی۔''[۵]

سرسید احمد خان نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز و محور علی گڑھ کو بنایا اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے کام شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی مذہبی، سیاسی اور علمی و ادبی زندگی کو متاثر کرنے والی اس تحریک کو علی گڑھ تحریک کا نام دیا گیا۔

بقول عابد حسین:

> ''علی گڑھ تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی یہ ہندوستان کے دورِ بیداری کا ایک اہم جزو تھی اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو حالات کا ساتھ دینا وقت کے تقاضوں کو سمجھنا اور مایوسی کے چنگل سے نکلنا سکھایا تھا۔''[۶]

سرسید نے ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں سب سے پہلا فارسی مدرسہ قائم کیا دوسرا سکول جس میں انگریزی تعلیم بھی دی جاتی تھی ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں قائم کیا اور غازی پور ہی میں ۱۸۶۳ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس سوسائٹی کا مقصد انگریزی ادب کا ترجمہ اُردو زبان میں کرنا تھا۔ اس ضمن میں سائنس، تاریخ اور ادب کی بہت سی کتب کو اُردو کا جامہ پہنایا گیا۔ سرسید جانتے تھے اس اقدام کے بغیر جدید جدید علوم کو برصغیر میں نہیں پھیلایا جا سکتا۔ اسی طرح ۱۹۷۰ء میں کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند کے قیام کا مقصد مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کیلئے علی گڑھ میں محمڈن اورینٹل کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مسلمانان ہند کی تعلیمی ترقی کا ایک اور اقدام ۱۸۷۵ء میں ایم۔اے۔او ہائی سکول علی گڑھ کا قیام تھا ۱۸۷۷ء میں ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کا قیام عمل میں آیا جو کہ جدید تعلیم کا مرکز بن گیا۔ سرسید نے اسی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ ۱۸۷۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی تاکہ برعظیم کے مسلمانوں کو حصول تعلیم کیلئے آمادہ کر لے اس کانفرنس کے اجلاس ہر سال مختلف شہروں میں منعقد کئے جاتے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو درپیش دیگر مسائل بھی یہاں زیرِ بحث لائے جاتے۔

اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کے ذریعے سرسید کی خدمات ناقابل فراموش ہیں جو نئے ادب کے آغاز اور ترویج و ترقی کا باعث بھی ہیں۔ اس ضمن میں رسالہ تہذیب الاخلاق ۱۸۷۰ء میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور بے شمار موضوعات پر لکھا گیا۔ اس سے پہلے اُردو میں مضمون نگاری کا رواج نہ تھا۔ سر سید نے شعوری طور پر مضمون (Easy) کی صنف کو متعارف کروایا۔ خود اور رفقاء کار نے اسے اختیار کئے رکھا جس سے نو وارد شہسواروں کیلئے ایک پلیٹ فارم کی راہیں ہموار ہوئیں۔ سرسید کی تصانیف کی فہرست کافی طویل ہے یہاں چند ایک کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ ''آثار الضادید میں ۱۸۴۷'' میں عمارات دہلی کا حال ہے، ''رسالہ اسباب بغاوتِ ہند'' ۱۸۵۹ء میں جنگِ آزادی کے اسباب و علل سے روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ انگریزوں کی مسلمانوں کے خلاف غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکے، ''خطبات احمدیہ'' ۱۸۷۰ء میں سر ولیم

میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب بڑی محنت و جانفشانی سے لکھا گیا ہے،''احکام طعام'' میں ثابت کیا کہ اہل کتاب کا پکا ہوا کھانا کھانا جائز ہے،''تبیس الکلام'' ۱۸۶۲ء میں بائبل کی تفسیر نئے اصولوں کے مطابق لکھی،''تفسیر قرآن'' سات جلدیں،''سرکشئ بجنور'' میں ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ تک کے حالات واقعات جو بجنور میں جنگ آزادی کے دنوں میں گزرے ان کی تفصیل اور کئی دوسرے مذہبی رسائل لکھے گئے۔ان کی تصانیف تاریخی و مذہبی مباحث سے گہرے شغف کا پتہ دیتی ہیں سرسید کی بدولت اُردو میں مضمون نگاری کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ اس میں سیاسی،اخلاقی،تاریخی،تنقیدی غرض ہر طرح کا موضوع اپردو ادب کے دامن میں پھلنے پھولنے لگا۔

سرسید کے نظام شمسی میں مولانا حالؔی اُردو کے انقلابی نقاد ہیں جو کہ شاعری کی اصلاح کا سبب بنے۔دیوان حالی کا شہرۂ آفاق ''مقدمہ شعروشاعری میں پرانی شاعری کے نقائص اور جدید شاعری کے اصول وضع کر کے شاعری کا دامن وسیع تر کیا۔حیاتِ سعدی ۱۸۸۶ء حیات جاوید ۱۹۰۱ء اور یادگارِ غالب ۱۸۹۷ء جیسی مقبول سوانح عمریاں لکھ کر نئی صنفِ نثر کا اضافہ کیا۔مسلمانان ہند کی بیداری میں ''مسدسِ حالی'' نے کچھ کم کردار ادا نہیں کیا۔

بقول شیخ اکرام:

''مسدس دنیا کی پانچ سات اہم ترین طویل نظموں میں سے ہے حالی اگر قوم کا یہ مرثیہ لکھ دیتے اور اس کے علاوہ کچھ نہ کرتے تب بھی قوم کے محسنوں میں انکا شمار سرسید اور وقار الملک کے ساتھ ساتھ ہوتا''[۷]

''مسدس حالی'' یا'' مدوجزرِ اسلام'' حالی کی مشہور نظم سرسید کی تحریک پر لکھی گئی اور جون ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی جس میں مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کیلئے اسلام اور تاریخ کے پرشکوہ کارناموں کو پہلی بار بیان کیا گیا۔جس میں عرب کی حالت،رحمت عالم کی بعثت،قرآن کی تاثیر،اسلام کا پر فخر دور فتوحات کا حیرت انگیز دور اور علوم وفنون کی ترقی کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

شبلی نعمانی نے بحیثیت شاعر،سوانح نگار،مورخ،مکتوب نگار،نقاد کے قوم کی خدمت کی ہے۔شبلی نے اپنی سوانح عمریوں کے ذریعے اخلاقیات اور مذہبی اقدار کے تحفظ کا کام کیا ہے۔شبلی سیرت النبی اگرچہ مکمل نہ کر سکے (جسے بعد میں ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا تھا) مگر ان کے خطوط سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح انہوں نے محنت و جانفشانی سے مواد اکھٹا کیا۔الفاروق ۱۸۹۸ء المامون،الغزالی،سیرۃ النعمان،سوانح مولانا روم لکھ کر مسلمانوں کو اسلامی تاریخ سے روشناس کرایا۔شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر ۱۹۵۴ء جیسی کتابیں لکھ کر حالی کے بعد تنقید کے نظری اور عملی پہلوؤں کو بیان کیا

بقول سید عبداللہ:

''مورخ،سوانح نگار اور شاعر شبلی تنقید میں بھی ایک مسند کے مستحق ہیں۔''[۸]

اس کے علاوہ مکتوب شبلی،مقالات شبلی،خاص اہمیت کی حامل ہیں؟''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر''سفرنامہ مصروشام کمالِ توازن واستدلال اور نئی انشاء پردازی کی داغ بیل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد سرسید تحریک کے اہم رکن پہلے ناول نگار جنہوں نے معاشرتی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اپنی ناول نگاری کے ذریعے افسانوی ادب کو آسان فہم اُردو زبان اور جیتے جاگتے انسانی کرداروں او رمعاشرتی مسائل سے روشناس کروا کر مافوق الفطرت عناصر،الف لیلوی داستانوں سے آزاد کیا

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''نذیر احمد کی ناولوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ان کے ذریعے ہندوستان مسلمانوں کی معاشرت کے ایک اہم دور کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔''[۹]

نذیر احمد کی تصانیف میں ''تعزیرات ہند'' ۱۸۶۱ء انڈین پینل کوڈ indian panal code کا ترجمہ تعزیرات ہند کے نام سے کیا جو بہت مقبول ہوا''چند پند بچوں کی تعلیم وتربیت اور نصیحت کیلئے تحریر کی''منتخب الحکایات'' ۱۸۶۹ء اس میں دلچسپ اور نصیحت اموز حکایات ہیں''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء لڑکیوں کی تربیت وآداب کے سلسلے میں دو بہنوں اصغری،اکبر کی دلچسپ کہانی پہلا ناول بن گئی۔

بنات النعش ۱۸۷۳ء یہ مراۃ العروس کا دوسرا حصہ یا تتمہ ہے جس میں اصغری طبقۂ نسواں کی اصلاح کا کام اپنے ذمہ لیتی ہے۔''توبتہ النصوح'' ۱۸۷۷ء اوالاد کی صحیح تعلیم وتربیت پر ناول ہے۔''ابن الوقت'' ۱۸۸۸ء مغرب کی طرز معاشرت پر بھرپور طنزیہ ناول ہے۔''ایامیٰ'' ۱۸۹۱ء بیواؤں کے نکاح کی ضرورت واہمیت پر ناول ہے۔''رویائے صادقہ'' ۱۸۹۱ء ناول کی صورت میں عقائد کا بیان ہے''ترجمہ قرآن مجید'' ۱۹۰۳ء نذیر احمد اسے توشۂ آخرت کہتے تھے جو نہایت سلیس انداز میں ترجمہ کیا گیا ہے۔''الحقوق والفرائض'' ۱۹۰۲ عقیدوں اور مسئلوں کے بارے میں عقلی بیانات کی تین جلدیں ہیں۔''امہات الائمہ'' ۱۹۰۹ تعداد ازواج پر ایک پادری کے فتوے کا جواب جسے مذہبی اختلافات کے باعث جلا دیا گیا۔''موعظۂ حسنہ'' بیٹے کے نام نصیحت آموز خطوط کا مجوعہ ہے۔مصائب غدر ۱۸۵۷ء کے غدر کے حالات قلم بند ہیں۔''نظم بے نظیر'' نذیر احمد کی نظموں کا مجموعہ ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''نذیر احمد کے خیالات ۔۔۔سے بات اچھی طرح روشن ہے کہ وہ اس دور کے صحیح نمائندہ وترجمان تھے۔انہوں نے اپنے دوسرے افقاء کی طرح ذہن کو بدلنے کیلئے بہت سا ادب پیدا کیا اور یہ ادب ایسا ادب تھا جس کا تعلق خواص سے زیادہ عوام سے تھا اس لحاظ سے ۔۔۔نذیر احمد کو سرسید کے افقاء میں سب سے زیادہ عوامی کہا جا سکتا ہے۔''[۱۰]

مولانا محمد حسین آزاد جدید اُردو شاعری کے بانی ہونے کے ساتھ ساتھ اسلوب نگارش کی انفرادیت کے باعث بہترین صاحب انشاء پرداز بھی ہیں اسلوبِ نگارش کی انفرادیت کے باعث بہترین صاحبِ انشاء پرداز بھی ہیں۔ سرسید تحریک کی کرنیں راہِ راست نہ سہی مگر اس نظامِ شمسی سے پیدا ہونے والے علمی وفکری تاثر سے متاثر ضرور ہوئے۔ آزاد نے ''دربارِ اکبری'' لکھ کر عہدِ اکبر کی تاریخ رقم کی ہے جس کی عبارت فنِ اسلوب میں کمال رکھتی ہے۔ ''مجموعہ نظمِ آزاد'' یہ حسن وعشق کی قید سے آزاد اخلاقی و قومی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ''سخندان پارس'' جس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں فارسی زبان کی اصل نسل بیان کرنے کے لیے زبان کی تبدیلی کے اُصول اور دوسرے حصے میں ایران کی آب و ہوا اور وہاں کی تہذیب ومعاشرت کے اثرات فارسی شاعری پر کیسے پڑے بیان ہوا ہے۔ ''نگارستان پارس'' ہندوستان کی تاریخ ہے اس میں مسلمانوں کی ہندوستان آمد کا تذکرہ ہے۔ نیرنگ خیال ۱۸۸۰ء آزاد کے مضامین کا مجموعہ جو کہ دو حصوں میں شائع ہوا۔ ''آب حیات'' آزاد کی شاہکار تصنیف جو کہ پرانی تذکرہ نگاری سے ہٹ کر لکھی گئی جس میں شعراء کا تذکرہ، ناک نقشہ تعارف اور نمونہ کلام تنقید اور زبان کا عہد بہ عہد ترقیوں کا جائزہ شامل ہے۔

بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''آزاد کی اصلی شہرت آبِ حیات ۱۸۸۰ء کی وجہ سے ہے۔۔۔ یہ پہلی کتاب ہے جس نے تذکروں کی فہرست ساز تنقیدی روایات سے انحراف کیا۔''[۱۱]

جس دور میں آزاد لاہور مقیم تھے۔ ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے نام سے ایک ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا مقصد اُردو شاعری کو مبالغہ آرائی سے پاک کر کے تشبیہ واستعارات کے بوجھ سے نکالا جائے اس انجمن میں اس مقصد کے تحت جو مشاعرے ہوتے۔ اس میں طرح مصرع کی بجائے نظم کا عنوان دیا جاتا۔ اس تحریک میں حالی بھی شامل تھے لہٰذا آزاد نے نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالنے اور فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا گویا نثر کے ساتھ نظم کا ناطہ بھی برابر زندگی سے جوڑا جاتا رہا اسلوب ومقاصد میں سلیس اور آسان زبان وبیان اور زندگی کے مسائل کو اہمیت دی گئی۔ متذکرہ عناصر خمسہ کے علاوہ سرسید کے رفقاء میں ذکا اللہ خان روز اول سے سرسید تحریک سے وابستہ رہے ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی رکنیت حاصل کی ساتھ ہی ساتھ محمڈن کالج کے ٹرسٹی اور متعدد کمیٹیوں کا ممبر بھی رہے۔[۱۲]

ذکا اللہ اُردو زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے حامی تھے سائنٹیفک سوسائٹی کے فروغ کیلئے لگاتار کتابیں لکھتے رہے۔[۱۳]

مولوی چراغ علی کو سرسید سے قربت کی ایک وجہ یہ تھی کہ مذہبی مناظرہ اور تحقیق کا خاص شغف رکھتے تھے چنانچہ سرسید کے ساتھ مل کر معترضینِ اسلام کی تردید میں مضامین لکھے جو اُن کی ناقابلِ فراموش خدمت ہے[۱۴]۔ اُن کی مشہور تصانیف میں تعلیقات، تحقیق الجہاد، علومِ جدید اور

اسلام، قدیم قوموں کی مختصر تاریخ، اسلام کی دنیاوی برکتیں قابلِ ذکر ہیں۔ نواب محسن الملک کا اصل نام مہدی علی خان تھا جب سرسید کی وفات ہوئی تو علی گڑھ کالج پر پچاس ہزار روپے کا قرض تھا۔ ۳۱/مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات ہوئی صرف چار دن بعد کالج میں طلباء کی تعداد فقط ۳۴۳ رہ گئی۔ اِن نازک حالات میں نواب محسن الملک کو کالج کا سیکرٹری چُنا گیا۔ اُنہیں کی انتھک کوشش ومحنت سے کالج کی سالانہ آمدنی جو ۱۸۹۸ء میں ۷۲ ہزار تھی۔ نو سال میں ڈیڑھ لاکھ ہوگئی پانچ چھ سال میں مسلم یونیورسٹی کے لیے چھ لاکھ کا چندہ جمع ہوگیا اِن نامساعد حالات میں محسن الملک علی گڑھ تحریک کے لیے مسیحا ثابت ہوئے اور کالج کو نئی زندگی دینے کا سبب بنے۔[۱۵]

بقول مولوی بشیر الدین:

> ''نواب محسن الملک کا نام اور کام کی بلندی اور برگزیدگی کا بچہ بچہ قائل ہے اُن کی ذات میں سرسید کو ایک سچا جانثار، دوست، علی گڑھ تحریک کو ایک انتھک اور پُر جوش مبلغ اور ایم۔اے۔او کالج کو ایک فیاض طبیعت مربی اور محسن مل گیا۔''[۱۶]

سرسید کی طرح اِن کی تحریروں میں قوم کے مسائل پر گہری نظر ملتی ہے اُن کی تحریروں میں منقطی استدلال اور سادگی پائی جاتی ہے۔ ''کتاب المحبت و الشوق'' مجموعۂ لیکچر، آیات بنیات اور تہذیب الاخلاق میں چھپنے والے کئی مضامین قابلِ ذکر ہیں۔

نواب وقار الملک نے محسن الملک کے بعد مسلمانوں کی قیادت سنبھالی اُن کا اصل نام مشتاق حسین تھا۔ محسن الملک کے بعد آپ کو تین سال کے لیے علی گڑھ کالج کا آنریری سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ سرسید نے بوجوہِ مصلحت مسلمانوں کو سیاست سے دُور رہنے کی تاکید کی تھی۔ محسن الملک اور وقار الملک بھی اسی پالیسی پر عمل پیرا رہے مگر جب مسلمانوں کے سیاست میں اُترنے کا وقت آیا تو وقار الملک ہی کی کوشش سے مسلم لیگ قائم ہوئی۔[۱۷]

بقول بشیر الدین:

> ''سرسید کے رفیقوں میں محسن الملک اور وقار الملک کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے اس میں کلام نہیں کہ دونوں علی گڑھ تحریک کے ستون تھے۔''[۱۸]

سید امیر علی کو اللہ نے اس قدر دین اسلام کی سوجھ بوجھ عطا کی تھی کہ وہ مغربی اُصولوں اور خیالات کے سامنے مذہبِ اسلام کی صحیح تصویر پیش کر سکتے تھے۔ اگرچہ سرسید بھی بے پناہ ذہنی زرخیزی رکھتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سید امیر علی جیسے اسلامی شغف رکھنے والے معاونین اِن کے دست وبازو تھے جو مغربی خیالات اور دینِ اسلام کا صحیح موازنہ اور ترجمانی کر سکتے تھے۔[۱۹]

مولوی سمیع اللہ خان علی گڑھ تحریک کے معاونوں میں شمار ہوتے ہیں۔ سرسید جب کسی کالج یا

مدرسے کے کھولنے کا ارادہ کرتے اُنہیں مسلمانوں ہی کی مخالفت کا سامنا درپیش رہتا کیونکہ مسلمان یہ گمان کرتے کہ شاید سرسید مسلمان لڑکوں کو عیسائی بنانے کے لیے جال بُن رہے ہیں لہٰذا مختلف جلسوں میں مولوی سمیع اللہ سرسید کی اِن کوششوں کو تعبیر دینے کے لیے تجاویز دیتے جو کہ عملی صورت ملنے پر کامیابی کا باعث بنتی۔[۲۰]

گویا سرسید ایسے نظامِ شمسی کی حیثیت رکھتے تھے جس کے تمام ستارے و سیارے سرسید کا دست و باز و ہوتے اور اس نظامِ شمسی کی کرنیں برِعظیم کے چپے چپے کو جگمگا رہی تھیں جس کی روشنی سے آج ہم بہرہ ور ہیں اِن کے رفقاء کا بارے عابد حسین نے سچ کہا ہے۔

> ''سرسید کے ادبی کارنامے تہذیب الاخلاق اور اُس کی جاندار نثر، علمی اور ثقافتی مسایل پر بحث مباحثے، ڈاکٹر نذیر احمد کے ناول اور لیکچروں کے مجموعے، خواجہ الطاف حسین حالی کی شاعری اور تنقیدی بصیرت، محسن الملک، چراغ علی، وقار الملک، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی کے ادبی کارنامے ___ شبلی کی ادبی اور علمی شاہکاران سب سے بڑھ کر وہ زندہ تحریک اور ترقی پذیر ادبی اور علمی فضا جو اِن بزرگوں کے کارناموں سے وجود میں آئی۔ یہ ساری چیزیں علی گڑھ تحریک کے دفترِ عمل میں لکھی جائیں گی۔[۲۱]

علی گڑھ تحریک محض علمی اور سیاسی تحریک نہ تھی اِس نے ایک خاص مکتبِ فکر اور طرزِ زندگی سے متعارف کروایا اس تحریک کی نمایاں خصوصیات مقصدی، استدلالی، عقل پسندی، مادی اقدار زندگی، دنیاوی ہوش مندی اور دینی اقدار کے احیاء کو فروغ دیا۔ سرسید کے رفقاء کے علاوہ اس تحریک نے بہت سے ادیبوں کو متاثر کیا جن میں مولانا وحیدالدین سلیم، نواب عماد الملک، مولانا عبدالحلیم شرر، نواب حیدر یار جنگ، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا طفیل احمد منگلوری، مولانا ظفر علی خان، سجاد حیدر یلدرم، مولوی عزیز مرزا، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر سر رضا الیاس برنی، آل احمد سرور، علی سردار جعفری، مجنوں گورکھپوری، مسعود حسین خان، خورشید الاسلام، معین احمد جذبی، اختر الایمان، مجاز لکھنوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، محمد حسن، قمر رئیس راہی، معصوم رضا، قاضی عبدالستار، بشیر بدر اور سریار قابلِ ذکر ہیں۔

سرسید احمد خان کے اہم اقدامات میں اہم ترین اقدام مدرسۃ العلوم کی تاسیس (۱۸۷۵ء) ہے۔ ۸/جنوری ۱۸۷۷ء کو ایم۔اے۔او کالج کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ کالج ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی بنا اس وقت اس دانشگاہ میں علوم وفنون کے بے شمار شعبے قائم ہیں۔ ۱۹۲۰ء لے کر ۲۰۰۰ تک انیس وائس چانسلروں کی سربراہی میں اَسی ۸۰ سال کا سفر طے کرنے والا سرسید کے ہاتھوں سے یہ لگایا ہوا پودا مضبوط اور تناور درخت بن چکا ہے[۲۲] اور سرسید کے رفقاء سے لے کر اس تحریک سے وابستہ مشاہیر ادب نے

خوب خوب اُس کی آبیاری کی اور مسلمانوں کو وقت کے تقاضوں کے ساتھ چلنا سکھایا۔

بقول سید عابد حسین:

> ''علی گڑھ تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی یہ ہندوستان کے دورِ بیداری کا ایک اہم جُز تھی اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو حالات کے ساتھ دینا وقت کے تقاضوں کو سمجھنا اور مایوسی کے چنگل سے نکلنا سکھایا تھا۔''[۲۳]

سرسید کی کوشش رنگ لائیں۔ مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں مثبت تبدیلیاں رُونما ہونے لگیں۔ انگریزی تعلیم کی بدولت سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو نمائندگی ملنا شروع ہوگئی۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین اور سائنٹیفک سوسائٹی کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کے اثرات کے نتیجے میں مسلمانوں کی سماجی زندگی میں بھی تبدیلیاں رُونما ہونا شروع ہوئیں۔ وہ رسم و رواج جو ہندوؤں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے راہ پا گئے تھے وہ پوری طرح ختم تو نہ ہوئے لیکن مسلم معاشرے میں ایک احساس پیدا ہوا کہ یہ رسم و رواج اسلامی احکامات کے تحت نہیں محض دنیاداری کا نتیجہ ہیں۔

مذہبی طور پر بھی فکری بیداری نے راہ پائی۔ قرآن و حدیث کی تعبیر جدید فکری مناسبت سے مقبول ہوئی اور اسلام احکامات کے علمی پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ سرسید احمد خان نے علی گڑھ کو ایسا اقامتی ادارہ بنانا چاہتے تھے جس میں سائنسی علوم مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مسلمان آخر الزماں آنحضرتؐ کی تعلیمات و سیرت سے مکمل طور پر دلوں کو معمور رکھیں۔ سرسید نے قرآن کی تفسیر لکھی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا، سرسید خود اور اُن کے رفقاء مذہبی مناظروں میں بھی توہم پرستی، فضول رسومات اور جاہلانہ عقائد کو کم کرنے کی کوشش مسلمانوں میں روشن خیالی، وسعتِ نظری اور فراخدلی جیسے اوصاف پیدا کیے۔

معاشی و اقتصادی لحاظ سے بھی علی گڑھ تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔ سرسید نے اِسی تحریک کے ذریعے مسلمانوں کو ترقی یافتہ بنایا اور کوٹہ مقرر کروایا تاکہ ملازمتوں کا حصول ممکن ہو سکے اور مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر بنائی جا سکے۔

سیاسی قیادت کی فراہمی اسی تحریک سے ممکن ہوئی اگرچہ ابتدا میں سرسید نے مسلمانوں کو سیاست سے دُور رہنے کی تلقین کی اور مسلمانوں کو زیورِ تعلیم سے بہرہ ور کیا۔ خاص کر جدید علوم، جدید ترقی اور جدید تعلیم سے روشناس کروایا۔ اس سلسلے میں اُن پر انگریزوں کا پٹھو ہونے کے الزامات بھی لگے مگر سرسید نے اِس کی پَروا نہیں کی اور علی برادران جیسے رہنماء پیدا کیے جو انگریز سامراج کے لیے مضبوط دیوار بن گئے۔ جیسے مسلمان تعلیمی لحاظ سے مضبوط ہوتے گئے۔ سرسید کے دل میں یہ خیال کھٹکنے لگا کہ مسلمان اپنے شاندار ماضی اور روایات رکھنے کے باوجود ہندوؤں کے محکوم بن جائیں گے کیونکہ ہندو اپنی چالاکی کے باعث مغربی جمہوریت سے ہر میدان میں خود کو منوالیں گے اور مسلمانوں پر غلبہ پالیں گے لہٰذا سرسید

نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی سیاسی طور پر عملی کوششیں شروع کر دیں مثلاً

۱۔ جداگانہ طریقۂ انتخاب کا مطالبہ شروع کر دیا تا کہ دونوں قومیں اپنے اپنے مفاد کا بہتر تحفظ کر سکیں۔

۲۔ اِسی طرح ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ مقرر کرنے کی تحریک بھی چلائی یہ تعلیم ہی تھی کہ آل انڈیا کانگرس نے تعلیمی قابلیت کی بنیاد پر ملازمتیں دینے کا مطالبہ کیا۔

۳۔ پاکستان حاصل کرنے کی کامیابی تحریک علی گڑھ ہی کی مرہونِ منت ہے کہ اِسی تحریک کے فارغ التحصیل طلبہ ہی تحریک پاکستان کا باعث بنے۔ جن میں علی برادران اور مولانا ظفر علی خان جیسے نوجوانوں اور قوم کے ہر فرد بچہ، بوڑھا، جوان اور حتی کہ خواتین میں بھی جذبۂ آزادی بھر دیا۔

۴۔ شملہ وفد کی تیاری اور لارڈ منٹو وائسرائے ہند سے ملاقات تحریک علی گڑھ کا نتیجہ تھی۔ ۱۹۰۶ء میں شملہ وفد نے لارڈ منٹو وائسرائے ہند سے ملاقات کی اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ یہ اقدام مسلمانوں کو عملی طور پر سیاست میں لے آیا۔

۵۔ مسلم لیگ کی تشکیل کا فیصلہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس جو کہ ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ گویا ۱۹۰۶ء میں ہی مسلم لیگ کی تشکیل کی گئی جو کہ مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت تھی جس کوششوں کے باعث ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو مسلمانوں نے جداگانہ وطن پاکستان حاصل کیا۔

۶۔ علی گڑھ کے اولڈ بوائز قائداعظم کے دستِ بازو تھے تو گویا قائداعظم نے یہ فتح علی گڑھ کے میدان میں جیتی ہے اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مرکزی تنظیم بھی علی گڑھ میں قائم ہوئی۔

مسلم اتحاد کو فروغ دینے میں علی گڑھ تحریک نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ علی گڑھ برِعظیم کے مسلمانوں کا واحد تعلیمی مرکز تھا جس میں پورے ہندوستان کے طلبا تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے اس طرح مختلف علاقوں کے طلبہ میں ہمدردی، بھائی چارہ، اُخوت، یگانگت اور اتحاد و یکجہی کی فضا پیدا ہوئی۔ مولانا ظفر علی خان نے اِس اتحاد کی فضا کو بلند آہنگ یوں کہا ہے۔

درس اتفاق کا جو دیا شیخ و شاب کو
اٹھی گلی گلی سے صدا زندہ باد کی
بغض و نفاق و کنیہ سے سینے ہوئے ہیں پاک
جڑ کاٹنے چلا ہوں میں نخل فساد کی

سرسید نے جگہ جگہ تعلیمی ادارے کھولے اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعے ہندوستان بھر میں تعلیمی ادارے کھولنے کی ترغیب دی گئی جو علی گڑھ کا عکس لیے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ دانش گاہیں سیاسی وحدت اور سیاسی و معاشی ترقی کا پیش خیمہ بنیں۔

چونکہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ لہٰذا وہ مسلمانوں کو اپنا مخالف سمجھتے ہوئے ہر میدان میں پامال کر رہے تھے اِسی طرح مسلمان بھی انگریز اور انگریزی تعلیم کے حامی نہ تھے مگر جب تک مسلمان انگریزوں سے متعلق بدگمانی دُور نہ کرتے نہ ہی وہ انگریزی تعلیم حاصل کر سکتے جس کے بغیر ترقی کرنا، اپنے حقوق منوانا اور جدید تقاضوں کے ساتھ چلنا ناممکن تھا۔ چونکہ جدید علوم انگریزی میں تھے اور انگریزی سیکھے بغیر اس کا حصول ناممکن تھا۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ طبقے نے سرسید کا موقف سمجھتے ہوئے وسعتِ نظر سے کام لیتے ہوئے انگریز دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور یہ سرسید کی کوششیں ہی تھیں کہ جدید علوم کی تدریس کے لیے پورے ہندوستان میں ادارے کھولے گئے اور تھوڑی مدت میں مسلمان انگریزی اور جدید تعلیم کے میدان میں نمایاں نظر آنے لگے۔ تحریکِ علی گڑھ نے مسلمانوں کو ہر شعبہ ہائے زندگی میں رہنمائی مہیا کی یہی وجہ ہے قائداعظم علی گڑھ کے طلبہ کو اپنا دست و باز و سمجھتے تھے۔ انہیں طالب علموں نے برِعظیم کے مسلمانوں میں حصولِ پاکستان کی خاطر ہر قربانی کے لیے تیار کیے جس کا نتیجہ آج الگ وطن پاکستان کی صورت میں ہم حاصل کر چکے ہیں اور آج ہمیں پورے عزم سے یہ عہد کرنا چاہیے کہ اسلامی اقدار کی پاسداری کا خیال رکھیں گے اور اپنے وطن کی حفاظت و فلاح کے لیے شبانہ روز محنت اور جانفشانی سے آگے بڑھتے رہیں گے اور اپنے اصل ماخذات قرآن و سنت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں گے کہ ہم اُن کے بغیر اپنی سلامتی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ شیخ محمد اکرام: ''موجِ کوثر''، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۴۷۔

۲۔ // // // ص ۷۶-۷۷۔

۳۔ عابد حسین، سید، ڈاکٹر: ''سید کا خواب اور اُس کی تعبیر'' مشمولہ ''علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، مرتبہ نسیم قریشی، مسلم پریس لکھنؤ، ۱۹۶۰ء، ص ۱۹۔

۴۔ شیخ محمد اکرام: ''موجِ کوثر''، ص ۷۷۔

۵۔ عابد حسین، سید، ڈاکٹر: ''سید کا خواب اور اُس کی تعبیر''، ص ۱۔

۶۔ // // // ص ۴۴۔

۷۔ شیخ محمد اکرام: ''موجِ کوثر''، ص ۱۲۶۔

۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: ''اشاراتِ تنقید''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۲۰۵۔

۹۔ // ''سرسید احمد خان اور نامور رفقاء''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۲۴۔

۱۰۔ // ''سرسید احمد خان اور اُن کے نامور رفقاء''، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۲۶۴۔

۱۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰۴۔

۱۲۔ شان محمد: ''علی گڑھ موومنٹ''، علی گڑھ، سن ندارد، ص ۱۰۴-۱۱۰۔

۱۳۔ احتشام حسین: ''علی گڑھ کے اساسی پہلو''، مشمولہ ''علی گڑھ میگزین''، ۵۵-۱۹۵۴ء، ص ۲۶۔

۱۴۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: ''سرسید اور اُن کے نامور رفقاء''، ص ۶۸-۶۹۔

۱۵۔ شیخ اکرام: ''موجِ کوثر''، ص ۱۱۱-۱۱۲۔

۱۶۔ بشیر الدین مولوی: ''علی گڑھ تحریک کے معمار''، مشمولہ ''علی گڑھ میگزین''، ۵۴-۱۹۵۵ء، ص ۲۵۰۔

۱۷۔ نور الحسن نقوی: ''محمڈن کالج سے مسلم یونیورسٹی تک''، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۱ء، ص ۴۱-۴۲۔

۱۸۔ بشیر الدین مولوی: ''علی گڑھ تحریک کے معمار''، ص ۲۵۴۔

۱۹۔ شیخ اکرام: ''موجِ کوثر''، ص ۱۶۸۔

۲۰۔ نور الرحمٰن: ''حیاتِ سرسید''، ۶۳-۶۴ بحوالہ شجاع الدین فاروقی، ناموران، ص ۱۳۷۔

۲۱۔ عابد حسین، سید، ڈاکٹر: ''سید کا خواب اور اُس کی تعبیر''، ص ۱۔

۲۲۔ منور حسین، ڈاکٹر: ''شعبۂ اردو ایک تعارف''، مشمولہ ''فکر و آگہی''، دہلی، علی گڑھ نمبر، ۲۰۰۰ء، ص ۵۵۷۔

☆☆☆

ڈاکٹر طاہر مسعود

شوشو

میدان میں شام پڑ چکی تھی۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے حبس کی کیفیت تھی۔ مختلف عمروں کے چھوٹے بڑے بچوں پر مشتمل دو ٹیمیں فٹ بال کھیلنے میں مگن تھیں۔ ان میں یاسر بھی تھا۔ سب سے کم عمر کھلاڑی، یہی کوئی سات سال کا۔ تماشائی سوچتے ہوں گے خدا جانے کس نے اسے اس میچ میں کھیلنے کی دعوت دی ہے کیونکہ وہ سارے میدان میں گیند کے پیچھے پیچھے دوڑا پھرتا تھا اور گیند اس کے ہاتھ نہ آتی تھی۔ بڑی عمر کے کھلاڑی اسے گیند کے قریب پھٹکنے ہی کب دیتے تھے۔ جوں ہی وہ گیند کے نزدیک پہنچتا کوئی شارٹ گیند کو اس سے دُور کر دیتی تھی۔ یاسر دوڑ دوڑ کر ہلکا ہو چکا تھا لیکن اس کا شوق مدھم نہیں پڑا تھا۔ وہ کسی امید پر بہت لگن کے ساتھ گیند کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔

میں میدان سے باہر ایک درخت کے نیچے پُلیا پہ بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یاسر کی قابلِ رحم حالت پہ مجھے ترس آ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میدان میں داخل ہو کر گیند چھین کر اس ننھے سے کھلاڑی کے حوالے کر دوں تا کہ وہ جتنا جی چاہے کھیلے لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ کھیل کے اصول کے خلاف ہوتا۔ تھوڑی دیر بعد یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ گیند یاسر کے پاس تھی۔ وہ اسے لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ مسرت سے اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا لیکن ابھی وہ چند قدم آگے ہی بڑھا تھا کہ ایک لحیم شحیم لڑکے نے بڑی آسانی سے اس سے گیند چھین لی۔ اب یاسر اس کے پیچھے پیچھے تھا لیکن وہ بڑی عمر کا لڑکا اس کے قابو آتا تھا اور نہ گیند۔

میں نے منہ پھیر لیا۔ مجھ سے یاسر کی بے بسی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس کی بے بسی سے کسی کو بھی دل چسپی نہ تھی۔ کھیل دیکھنے والے اور کھیل کھیلنے والے سب کھیل میں منہمک تھے۔

یاسر کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ پیدا ہوا تھا۔ نرس نے اسے لا کر میری گود میں ڈال دیا تھا اور میں نے جھک کر اپنے اس اکلوتے بیٹے کی پیشانی پہ بوسہ دیا تھا اور نرس کو جب پانچ سو روپے کا نوٹ انعام میں تھمایا تو وہ ششدر رہ گئی: ''اتنی بڑی رقم!''

''جو بچہ تم نے مجھے لا کر تھمایا ہے، اس کے مقابلے میں یہ رقم بہت تھوڑی ہے۔''

یہ کہہ کر میں یاسر کو لیے بستر کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اس کے کانوں میں اذان اور اقامت کہی۔ اسے شہد چٹایا اور بارگاہِ ایزدی میں اس کی درازیٔ عمر اور کامیابی کی سچے دل سے دعا کی۔ میں ان دنوں بیمار تھا۔ طرح طرح کے ذہنی خلجان مجھے پریشان کیے رہتے تھے۔ لیکن عجیب سی بات ہے کہ یاسر کی آمد کے ساتھ ہی میں صحت مند ہوتا گیا۔

جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا، میری اس سے دوستی گہری ہوتی گئی۔ میں اسے پہلے رات کو لوری سناتا تھا، جب وہ کہانیاں سننے اور سمجھنے کے قابل ہو گیا تو کہانیاں سنانے لگا۔ لوری اور کہانی سننے کی عادت تو اس کی ایسی پختہ ہو گئی تھی کہ اس کے بغیر سوتا ہی نہ تھا۔ اب میں اسے دینی واقعات کہانی کی صورت میں سنانے لگا۔ وہ ان واقعات کو سن کر سوالات کرتا تھا، ایسے سوالات جن میں سے بعض کے جواب مجھے نہ آتے تھے اور میں اسے غلط سلط جواب دینے کے بجائے اپنی لاعلمی کو مان لیتا تھا۔ وہ ذہین تھا، خوبصورت تھا، بہت متحرک تھا۔ اسے کہانیوں میں رستم و سہراب کی کہانی سب سے زیادہ پسند تھی۔ ہر رات وہ اسی کہانی کو سننے کی فرمائش کرتا۔ خاص طور پر وہ حصہ جب سہراب، رستم کو پہچان کر اپنا ہتھیار پھینک دیتا ہے اور اپنے باپ رستم کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ بار بار اس حصے کو غور سے سنتا تھا۔ ایک دن جب میں اس سے کشتی لڑ رہا تھا اور لڑتے لڑتے جھوٹ موٹ کا چِت ہو گیا اور نعرہ مارا: ''سہراب جیت گیا، رستم ہار گیا۔'' تو یاسر نے میری پیشانی پہ ہاتھ رکھ کے کہا: ''پاپا! سہراب کیسے جیت سکتا ہے، اس کے پاپا نے تو اسے مار دیا تھا۔''

یہ سن کر میرے سینے میں ایک گھونسہ لگا۔ یہ کیسی بات تھی جو اسے یاد رہ گئی تھی۔ ''یاسر! کیا تم بھول گئے ___'' میں نے کہا: ''سہراب کی لاش پہ، اپنے قتل ہو جانے والے بیٹے کے سرہانے رستم بیٹھ کر کتنا رویا تھا۔''

''ہاں پاپا! وہ اپنے بیٹے کو مارنے کے بعد رویا تھا۔'' یاسر کی آنکھوں میں نمی تھی اور میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ کیا یاسر کو سہراب کی موت کا غم تھا یا اسے رستم کی سنگ دلی نے افسردہ کر دیا تھا۔ کون جانے!

برسات کا موسم آیا تو یاسر کو برانک کائٹس ہو گیا۔ وہ رات بھر کھانستا رہتا۔ کھانسی کا ایسا دورہ پڑتا کہ میں اور میری بیوی پریشان ہو جاتے۔ ہم نے اسے کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔ بہتیرا علاج کرایا لیکن کھانسی ٹھیک ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ جب وہ دوا دارو سے ٹھیک نہ ہوا تو میں اسے عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر لے گیا اور وہاں آہ و زاری کے ساتھ دعا کی۔ عجیب اتفاق دیکھیے کہ یاسر رفتہ رفتہ ٹھیک ہو گیا۔ اب وہ روزانہ صبح سویرے اسکول جانے کے لیے اُٹھ بیٹھتا۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے تیار کراتا۔ ناشتہ وغیرہ کرا کے اسے اسکول چھوڑنے جاتا۔ گاڑی سے اتر کر وہ خدا حافظ کہہ کر دوڑتا ہوا اسکول کے گیٹ کے اندر داخل ہو جاتا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتا میں اسے دیکھتا رہتا تھا۔

ایک دن میری بیوی نے عجیب بات کہی۔ اس نے کہا: ''آپ یاسر کے لیے برگد کا پیڑ ثابت ہو رہے ہیں۔ جس طرح کوئی ننھا منا پودا برگد کے پیڑ کے نیچے پھل پھول نہیں سکتا اسی طرح آپ کی شخصیت اس کی شخصیت کے بننے میں مزاحم ہو رہی ہے۔''

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ اسے چھوڑ دیجیے۔ اسے چھوٹے موٹے معاملات میں خود فیصلے کرنے دیجیے۔ آپ اس کی بیساکھی کیوں بنتے ہیں؟''

مجھے احساس ہوا کہ بیوی سچ کہہ رہی ہے۔ یاسر میرے اعصاب پہ چھا گیا تھا اور میں بھی ہمہ وقت اس کے دل و دماغ پہ سوار رہنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ لاشعوری طور پر سہی لیکن میں چاہتا تھا کہ یاسر میرے علاوہ کسی اور کی بابت کچھ نہ سوچے۔ یہ چیز اس کی ذہنی نشوونما کے لیے مفید نہ تھی۔ میں نے بتدریج اس سے فاصلہ قائم کرنا شروع کر دیا۔ اس نے جلد ہی محسوس کر لیا۔ وہ بہت ذہین تھا۔

''پاپا! آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔'' ایک دن اس نے پوچھا۔

''یہ تم نے کیسے جانا؟''

''آپ مجھے وقت نہیں دیتے۔ آپ میرے ساتھ کھیلتے نہیں ہیں۔''

''بیٹا! تم دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلا کرو۔ اب تم بڑے ہو رہے ہو۔''

''مجھے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنا اچھا نہیں لگتا، مجھے آپ کے ساتھ کھیلنا اچھا لگتا ہے۔'' اس نے بضد ہو کر کہا۔

میں نے اسے آکاس بیل بنا دیا تھا، جو قریب ترین دیوار یا درخت پر چڑھ جایا کرتی ہے۔ مجھے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ لیکن میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ وہ تنہائی کے احساس میں گھِر گیا ہے اور اس سے بچنے کے لیے کبھی کبھی وہ خود سے کھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔ لان کی کیاریوں کے درمیان وہ اپنے بازو ہوا میں لہراتا، منہ سے عجیب نامانوس آوازیں نکالتا اور بھاگتا رہتا۔ ایسا وہ بنا تھکے کئی گھنٹے تک کر لیا کرتا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اسے اس بے معنی عمل میں کیا مزہ ملتا ہے۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ لیا:

''یاسر! یہ تم بھاگ کر منہ سے شوشوشو کی آوازیں کیوں نکالتے ہو۔'' وہ جھینپ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں اس کی کتنی کڑی خبر گیری رکھتا ہوں۔

''میں کھیلتا ہوں۔''

''کوئی اکیلے بھی کھیلتا ہے یاسر!''

''آپ جو میرے ساتھ نہیں کھیلتے۔''

''کھیلتا تو ہوں لیکن ہر وقت تو نہیں کھیل سکتا۔ مجھے اور بھی کام کرنے ہوتے ہیں۔'' وہ چپ رہا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی ہے۔ اس کا کوئی بھی تو دوست نہیں تھا۔ وہ اکیلا تھا، بالکل اکیلا۔ میں نے بھی اسے وقت دینا کم کر دیا تھا۔ گلی کے بچوں میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے اپنے لیے ایک کھیل ایجاد کر لیا تھا۔ مجھے اسے نہیں روکنا چاہیے۔

''اچھا جاؤ، کھیلو۔'' وہ خوشی خوشی بھاگتا ہوا چلا گیا۔

جون جولائی کے مہینوں میں کراچی میں بہت گرمی پڑتی ہے، پھر موسم خوش گوار ہو جاتا ہے۔ آسمان اودے اودے بادلوں سے ڈھک جاتا ہے اور بہت لطیف ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ یاسر اب سات سال کا ہو رہا تھا۔ دوسری جماعت میں وہ تھرڈ آیا تھا۔ ہم میاں بیوی نے اسے تحائف سے لاد دیا۔ اسے سیر کرانے سمندر کے کنارے لے گئے۔ وہ سمندر کو پہلی بار دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''سمندر کے اس پار کیا ہے پاپا؟''

''سمندر کے اس پار بھی سمندر ہے یاسر۔''

اس نے کچھ کہا نہیں۔ ایسا لگا جیسے اس کے دل پہ سمندر کی ہیبت بیٹھ گئی ہے۔ ہم شام گئے تک ساحل پہ رہے۔ یاسر نے اونٹ اور گھوڑے کی سواری کی اور خوب ہنسا۔ اس کو ہنستے دیکھ کر ہم بھی ہنسنے لگے۔ یہاں تک کہ ہنستے ہنستے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ واپسی پہ وہ بہت سنجیدہ تھا۔

''پاپا! ہم سمندر پہ پھر کب آئیں گے؟'' اس نے دفعتاً پوچھا۔

''تم جب کہو گے!''

''کیا ہم روز آ سکتے ہیں؟''

''روزانہ!'' میں الجھ گیا۔ سمندر ہمارے گھر سے بہت دُور تھا۔ ایک گھنٹے کا سفر روزانہ طے کرنا اور دفتر سے وقت نکالنا میرے لیے آسان نہ تھا۔

''روز تو نہیں لیکن ہر اتوار کو ہم آ سکتے ہیں۔''

''نہیں پاپا۔ ہر روز۔ مجھے بہت مزہ آیا۔'' اس نے ضد کی۔ ہم میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ بولے نہیں۔ تنہائی کا کوئی روگ تھا جو اتنی کم عمری میں اسے لگ گیا تھا۔ میں اس احساس کو اس کے اندر سے کیسے ختم کروں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ تب ہی میں نے فیصلہ کیا کہ اسے دوسرے لڑکوں کے ساتھ گھلنا ملنا چاہیے۔

اگلی شام میں اسے لے کر میدان میں گیا۔ وہاں موجود اس کے ہم عمروں سے اس کا تعارف کرایا اور اسے اپنے ساتھ کھیل میں شامل کرنے کی درخواست کی۔ بچوں نے یاسر کا استقبال خوش دلی سے کیا۔ میں درخت کے سائے تلے پُلیا پہ بیٹھ کے دیکھ رہا تھا کہ میدان میں بھی یاسر تنہائی کا شکار ہے۔ وہ گیند چھیننے میں ناکام تھا اور بھاگ بھاگ کے نڈھال ہو رہا تھا۔

اس رات بستر پہ لیٹنے سے پہلے یاسر نے کہا: ''پاپا! میں لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔''

''کیوں بیٹے؟''

''وہ مجھے گیند نہیں دیتے۔''

''جب تم کھیلنا سیکھ جاؤ گے تو تمہیں گیند مل جائے گی۔''

''پاپا! ایک بات کہوں۔ آپ مانیں گے؟''

''کہو یاسر کیا بات ہے؟''

''میں لان میں شوشو کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے؟''

کئی مہینے ہونے کو آرہے ہیں۔ میں اور میرا بیٹا یاسر لان میں کیاریوں کے درمیان آہستہ قدموں دوڑتے ہیں، ہوا میں باز ولہراتے ہیں اور منہ سے شوشو کی آوازیں نکالتے ہیں۔ میرے بیٹے نے بہت عمدہ کھیل ایجاد کیا ہے۔ اس سے میرا احساسِ تنہائی بھی دُور ہو گیا ہے۔

☆☆☆

محمد امین الدین

کہانی سے پہلے کا ماجرا

میں نے جوں ہی قلم سنبھالا اسٹڈی تاریک ہو گئی۔ ''ہت تیرے کی۔'' منہ سے بے اختیار نکلا اور اچھی خاصی سوچی ہوئی کہانی دماغ سے اُچھل کر تاریکی میں تحلیل ہو گئی۔ لمحہ بھر کو سامنے رکھے کاغذ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یو پی ایس سے جو بلب اور پنکھے گھر کو روشن اور ہوادار رکھتے ہیں کچھ کام نہ آئے۔ یکا یک دھب کی آواز نے سناٹے اور تاریکی پر چھنا کے دار قہقہہ لگایا۔ بیوی چلائی۔

''دیکھ کر نہیں چلتے کیا؟''

''امی اندھیرے میں علی سامنے آ گیا۔''

میں نے اسٹڈی میں سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ابو۔ علی سے ٹکرا گئی تھی۔ ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا۔''

''ذرا سنبھل کر۔ اندھیرے میں پیر نہ زخمی ہو جائے۔ یہ یو پی ایس کیوں کام نہیں کر رہا۔''

''تین دن سے کہہ رہی ہوں کہ سوئچ بورڈ میں کچھ خرابی ہو گئی ہے مگر میری سنتا کون ہے۔''

بیوی نے یہ جملہ مجھ سے کہا تھا مگر اگلا بیٹے سے کہا۔ ''جلدی سے شاہ جہاں کو بلا کر لاؤ۔''

''امی اندھیرا بہت ہے اور کیمپس کے وہاں تو زیادہ ہی اندھیرا ہو جاتا ہے۔''

مجھے اندازہ تھا کہ یہ سُن کر میری بیوی نے ضرور مجھ کو دیکھا ہو گا جس کا مطلب میں خوب سمجھتا تھا لہٰذا میں خود ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ لاؤنج میں موم بتی کی مدھم روشنی میں میری بیٹی فرش پر بکھرے کانچ کے ٹکڑے سمیٹنے میں مصروف تھی۔ مجھے اُٹھتے دیکھ کر علی بولا۔

''ابو! شاہ جہاں انکل کو موبائل کر دیں۔''

''اس کا موبائل یونیورسٹی کے باہر لڑکوں نے چھین لیا۔ بے چارے کے ساتھ یہ واردات دوسری بار ہوئی ہے۔''

یہ کہتا ہوا میں گھر سے باہر نکل آیا۔ گلی میں اندھیرا تھا اور میں شام سے باہر نہ نکلا تھا۔ بے خبری میں جیسے ہی اسکول کی دیوار کے پاس سے گزرا، پیروں تلے چھپاک کی آواز آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پائینچے گندے ہو گئے۔ چھینٹے اچھل کر اوپر کُرتے تک آئے تھے۔ بدبودار پانی کے چھینٹے۔ میں سمجھ گیا۔ اسکول کا گٹر اُبل رہا تھا۔ گھر کی طرف پلٹنا چاہا مگر بیوی کے ڈر سے گندا پانی پھلانگتا ہوا آگے نکل گیا۔ تھوڑے فاصلے پر مین روڈ اور سامنے سڑک کے دوسری جانب یونیورسٹی کیمپس کے اندر شاہ جہاں کا فلیٹ تھا۔ سنٹرل آئی لینڈ عبور کرتے ہوئے اچانک اس احساس نے جکڑ لیا کہ سڑک کچھ اجنبی اجنبی سی ہے۔

میں نے خود کو مطمئن کیا ظاہر ہے گذشتہ سال بھر سے ابوالحسن اصفہانی روڈ زیرِ تعمیر ہے۔ روز کچھ نہ کچھ بدلا ہوا ہوتا ہے۔ میں کیمپس کے گیٹ پر پہنچا اور سیکورٹی گارڈ سے مخاطب ہوا۔

''بابا جی! شاہ جہاں گھر پر ہوگا؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے مسکن کی طرف گیا ہے۔''

''اس وقت! ____ کیوں؟''

''آپ کو نہیں معلوم؟ ____ بووی چک ☆ کے کاؤنٹر پر جو گورا سا لڑکا بیٹھتا تھا اسے ڈاکوؤں نے گولی مار دی اور کیش بھی لوٹ کر لے گئے۔''

''اوہ!'' میں نے افسوس کرتے ہوئے گردن ہلائی۔ مسکن کی طرف دیکھا۔ وہاں معمول سے ہٹ کر سناٹا تھا۔ سڑک پار کرتے ہوئے میری چھٹی حس نے صحیح اشارہ دیا تھا۔ بیکن ہاؤس کے سامنے کھلی جگہ پر سڑک بنانے والے ٹھیکیدار کی بھاری مشینری اور اس کے عین عقب میں چوراہے پر غیر معمولی بے ترتیبی تھی۔ قتل کا سُن کر میرا دل دھک کر کے رہ گیا۔ میں گارڈ سے کچھ کہے سُنے بغیر تیز تیز قدم اُٹھاتا گھر لوٹا۔ گلی میں مڑتے ہوئے دائیں سمت سے ایک رکشہ تیزی سے گزرا۔ عقب سے رکشے میں تنہا سیاہ برقعہ پوش خاتون دکھائی دی۔ میں بے ساختہ مسکرا دیا۔ رکشہ تیزی سے گلی میں بڑھتا چلا گیا۔ یکا یک میرے قدم بھی تیز ہو گئے۔ گندے بدبودار گٹر کے پانی کو ایک ہی جست میں پھلانگتا ہوا گزر گیا۔ میرا شک صحیح نکلا۔ رکشہ میرے اندازے کے مطابق ہی رُکا تھا۔ خاتون تیزی سے اُتری اور تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے سفید مرمریں عمارت میں گم ہو گئی۔ میں دھیمی مسکراہٹ سجائے اپنے گھر میں چلا آیا مجھے دیکھتے ہی بیوی نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔

''ایک منٹ پہلے آتے تو آج میں آپ کو پکا ثبوت دکھا دیتی۔'' میں سمجھ گیا کہ وہ کیا دکھانا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔

''میں نے گلی میں داخل ہوتے ہی دیکھ لیا۔''

''اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ محلّہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''اس گلی میں بارہ تیرہ دیگر محلے دار نہایت شریف اور نیک لوگ ہیں۔ ایک ایسا ہی سہی۔''

''ہوں!'' بیوی نے تنک کر جواب دیا اور پھر بولی۔ ''آپ سے تو بات کرنا فضول ہے۔ گئے تھے شاہ جہاں کو پکڑنے، اتنا سا کام نہ کر سکے۔''

تب میں نے مسکن پر ہونے والی واردات کا ذکر کیا تو وہ گھبرا کر بیٹے سے مخاطب ہوئی۔ ''آج کے بعد تم بووی چک پر گئے تو اچھا نہیں ہوگا۔''

☆ بووی چک کراچی میں ایک فاسٹ فوڈ کمپنی ہے۔

''آپ خود مجھے بار بار بھیجتی ہیں کبھی دہی لا دو تو کبھی ہری مرچ ہرا دھنیا۔''

''میں بووی چک جانے کے لیے منع کر رہی ہوں۔ مسکن نہیں۔''

''امی! مسکن جانے کے لیے بووی چک کے سامنے سے ہی گزرنا پڑتا ہے۔'' علی نے وضاحت کی۔ یکا یک مجھے خیال آیا کہ میری گاڑی کا ٹائر منتظر کے پاس ہے جو کہ بووی چک کے بالکل ہی برابر میں بیٹھتا ہے۔ شام کو دفتر سے آتے ہوئے میں نے پنکچر لگانے کے لیے دیا تھا۔ میں نے گاڑی کی چابی اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''منتظر سے ٹائر لے آؤں۔''

بیوی نے فوراً کہا۔ ''اولاد کو کیا منع کر سکوں جب باپ کے چلتر ہی اچھے نہ ہوں۔ اب جا کر تماشا دیکھیں گے کہ بووی چک پر کیا ہوا۔ ایسے موقع پر حادثے کی جگہ سے آدمی دُور ہی رہے تو بہتر مگر افسانہ نگار جو ہوئے۔ لوگوں سے پوچھنا اور تاکنا جھانکنا اچھا لگتا ہے۔''

''خدا کی بندی! وہاں منتظر کے پاس میرا ٹائر پنکچر لگا رکھا ہوگا۔ وہ لانا ہے اور اگر وہاں شاہ جہاں نظر آیا تو اُسے بھی لے آؤں گا تاکہ آپ کا یو پی ایس ٹھیک ہو جائے۔ اس میں افسانہ نگار کہاں سے آ گیا؟'' یہ کہہ کر میں جوں ہی پلٹا بجلی آ گئی۔ روشنی میں جیسے ہی بیوی کی نگاہ میرے کپڑوں پر پڑی وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

''اللہ توبہ ہے ____ یہ کیا کیا؟ نئے سفید سوٹ کا ستیاناس کر دیا۔ آپ تو حد ہی کر دیتے ہیں۔ بچوں سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں اور تماشا دیکھو گٹر کی گندگی لیے پورے گھر میں دندناتے پھر رہے ہیں۔''

''یار میں ابھی ابھی باہر سے آیا ہوں۔ اسکول کے سامنے والا گٹر اُبل رہا ہے۔ اندھیرے میں دکھائی نہیں دیا۔ کیا میں جان بوجھ کر گٹر کے پانی میں چھلانگیں مارتا پھروں گا؟''

''کیا پتا وہ رکشے میں برقعے والی کو دیکھ کر بھاگے ہوں گے۔ مرد سارے ہی ایک جیسے ہوتے ہیں۔''

''نیک بخت! واپسی پر میں پانی پھلانگ کر گزرا تھا۔''

''آپ کا پھلانگنا میں خوب سمجھتی ہوں۔ آپ پانی نہیں مجھے پھلانگنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔''

''کاش میں ایسا کر سکتا۔''

ہنس کر کہتا ہوا میں بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے پتا تھا کہ اس نے مجھے مصنوعی غصے میں دیکھا ہوگا کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ میں کتنا ڈرپوک شوہر ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میں کپڑے تبدیل کر کے اپنی اسٹڈی میں قلم تھام کر بیٹھ گیا اور دماغ میں تتر بتر ہوئی کہانی کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

احمد اعجاز

وہ، ماسی اور مسز ابراہیم

اس وقت سہ پہر کے تین بجا چاہتے ہیں۔ وہ ماسی کی گداز بانہوں میں ہے۔ آج بھی وہ حسبِ معمول دس بجے کے قریب سونے سے بیدار ہوا۔ ماسی نے اُسے ناشتہ دیا۔ اُس وقت اِس بات کا ذرا بھر بھی امکان نہ تھا کہ چند گھنٹوں بعد اُسے وہ اپنی گداز بانہوں میں بھر لے گی اور شرم وحیا کی قبا کو کھونٹی پر لٹکا کے یوں والہانہ چومنا چاٹنا شروع کر دے گی۔

وہ اپنے آبائی شہر سے یہاں لاہور ملازمت کے سلسلہ میں آج سے پندرہ روز پہلے جب اس فلیٹ پہ پہنچا تھا، دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ روانگی سے ایک روز پہلے عادل نے موبائل فون پہ اُسے سارا ایڈریس سمجھا دیا تھا۔ اُسے مطلوبہ فلیٹ ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہ ہوئی لیکن جب اُس نے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو عادل کی جگہ ایک خاتون نے دروازہ کھلا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے غلطی سے کسی اور فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا دیا ہے لیکن دروازہ پر جلی حروف میں وہی فلیٹ نمبر درج تھا جو عادل نے اُسے موبائل فون پہ بتایا تھا۔ تو پھر یہ خاتون کون ہے؟ شاید عادل کی کوئی رشتہ دار ہے۔ یا کہیں عادل نے دوسری شادی تو نہیں رچا۔۔۔ شاید وہ انہیں خیالات میں غلطاں رہتا کہ موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ موبائل کی سکرین پہ عادل کا نمبر تھا۔ ''ہیلو!'' اُس نے موبائل آن کر کے کہا۔ ''کہاں ہو؟'' دوسری طرف سے عادل کی آواز گونجی۔ ''بس پہنچا ہی چاہتا ہوں۔'' اُس کے منہ سے نکلا۔ عادل کی آواز پھر گونجی ''میں اس وقت شوروم میں ہوں۔ فلیٹ میں ماسی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔ جب پہنچ جاؤ تو اطلاع کر دینا۔ انشاءاللہ رات کو ملاقات ہوگی۔'' ''او کے'' اُس نے کہا اور ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ''جی عادل صاحب کا فلیٹ یہی ہے۔ یقیناً آپ اُن کے دوست یونس خان ہیں۔ اندر آ جایئے۔''

وہ دونوں جلد ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گے تھے اور یہ بے تکلفی اس قدر آگے سفر کر جائے گی ایسا اُس نے بالکل نہیں سوچا تھا۔ اب ماسی کے سرخ سرخ ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر پیوست ہیں۔ ایک ہاتھ اُس کے سر کے گھنے بالوں سے الجھا ہوا ہے اور دوسرا ہاتھ برہنہ کمر پر ادھر سے اُدھر پھسلتا جا رہا ہے۔

ماسی کا شمار بلاشبہ خوبصورت خواتین میں ہوتا ہے۔ اُس کی عمر پینتیس سے چالیس کے کہیں بیچ بیچ ہے۔ سرو قد، غربت کے باوجود بھرا بھرا جسم، ابھرا ابھرا زندگی سے لبریز سینہ، اجلی، دھلی دھلی رنگت اور گھنے سیاہ بال وہ کہیں سے بھی گھروں میں کام کرنے والی ماسی نہیں لگتی ہے۔ وہ دونوں دس بجے سے تین بجے تک کا وقت ایک ساتھ گزارتے تھے۔ وہ جب سو کر اُٹھتا ہے تو ناشتہ تیار ہوتا ہے۔ عادل اُس سے ایک گھنٹہ پہلے ناشتہ کر کے اپنے کام کو نکل جاتا ہے۔ ناشتہ کر چکنے کے بعد وہ دو بجے تک کیبل نیٹ ورک پر

اپنے پسند کے پروگرام دیکھتا رہتا ہے۔ اس دوران ماسی نیچے مارکیٹ سے سبزی وسودا سلف لے آتی ہے۔ ماسی کا آدھا وقت کچن اور آدھا اُس کے ساتھ ٹی وی دیکھنے میں گزرتا ہے۔ دو بجے تک کھانا تیار ہو جاتا ہے۔ وہ ڈھائی بجے کے قریب اُٹھ کر نہاتا ہے۔ تین بجے کھانا کھاتا ہے بلکہ وہ اور ماسی ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلتا ہے۔

آج بھی حسبِ معمول دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد ماسی کچن میں چائے بنانے چل دی اور وہ لیٹ کر فلم دیکھنے لگ گیا۔ ماسی چائے تیار کر کے آئی تو وہ اُٹھ بیٹھا۔ ماسی نے دونوں کپ چھوٹی میز پر رکھ دیئے اور خود کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ چائے سے پہلے آدھا گلاس پانی لینا چاہتا تھا۔ اُس نے ماسی سے کہنا مناسب نہیں سمجھا اور خود کچن میں رکھے فریزر سے پانی پینے چل دیا۔ وہ پانی پی کر پلنگ پر بیٹھا ہی چاہتا تھا کہ ماسی نے اسے روک لیا۔ اُسے ماسی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی۔ وہ اس چمک سے زندگی میں پہلی مرتبہ آشنا ہو رہا تھا۔ پھر ایکا ایکی ماسی نے اُسے اپنی گداز بانہوں میں لے لیا۔ وہ اس اچانک رونما ہونے والی صورتحال سے گھبرا اُٹھا شاید وہ اس اچانک رونما ہونے والی صورتحال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اور سب کچھ اس قدر جلد ہوا کہ اُسے سوچنے، سمجھنے اور کچھ کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اس وقت وہ سیدھا پلنگ پر لیٹا ہوا ہے اور ماسی اُس پر جھکی ہوئی ہے۔ کیبل نیٹ ورک پر شاہ رخ خان کی فلم ''دل سے'' چل رہی ہے۔

ساڑھے تین بجے تک ماسی چلی جاتی ہے۔ اُس کے جانے کے بعد وہ ٹی وی بند کر کے کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ مطالعہ اُس کا شوق بھی ہے اور ضرورت بھی۔ لاہور میں وہ اپنا مستقبل سنوارنے کے ساتھ ساتھ اپنے مطالعہ میں بھی وسعت دینا چاہتا ہے۔ ساڑھے تین سے ساڑھے چھ تک وہ مختلف کتابوں میں محو ہو جاتا ہے۔ ساڑھے چھ سے پونے سات تک وہ جو کچھ پڑھ چکا ہوتا ہے اُس کے اہم پوائنٹس ڈائری پر درج کرتا ہے پھر وہ لباس تبدیل کر کے نیچے مارکیٹ میں چل دیتا ہے اور وہاں سے گھر فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دیتا ہے۔ سات بجے وہ اپنے فلیٹ کے بالمقابل فلیٹ میں رہنے والی اُس بوڑھی خاتون کے پاس پہنچ جاتا ہے جو ٹیرس پہ دو کرسیاں ڈال کر بیٹھی ہوتی ہے۔ ایک خالی کرسی پر وہ بیٹھ جاتا ہے۔ بوڑھی خاتون جسے وہ مسز ابراہیم کہہ کر پکارتا ہے ایک عرصہ سے اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ یہاں رہائش پذیر ہے۔ مسز ابراہیم چونکہ بوڑھی ہو چکی ہے اس لیے وہ اَن گنت سیڑھیاں اُتر کر کہیں آنے جانے سے قاصر ہے۔ شام کے وقت ٹیرس پر بیٹھنا ہی اُس کا مشغلہ اور ٹیرس ہی اُس کی تفریح کی کل کائنات ہے۔ اُس کے وہاں جانے کے تھوڑی دیر بعد مسز ابراہیم کی بہو دو کپ چائے لا دیتی ہے۔ مسز ابراہیم کے بیٹے کی شادی کو چند ماہ ہوئے ہیں۔ وہ سرکاری ملازم ہے۔ دو بجے ڈیوٹی سے لوٹتا ہے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر باہر دوستوں کے ساتھ نکل جاتا ہے اور پھر رات گئے واپس آتا ہے۔ مسز ابراہیم کی بہو جو اُن کی سگی بہن کی بیٹی ہے، بہت خوش سلیقہ ہے۔ کھانا بہت اچھا پکاتی ہے۔ گھر کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ شوہر اور ساس کا بہت

خیال رکھتی ہے۔ مسز ابراہیم اپنے بیٹے سے نالاں رہتی ہے اس لیے کہ وہ اپنی بیگم سے اچھا سلوک نہیں کرتا ہے۔ خواہ مخواہ اُسے ڈانٹتا رہتا ہے حالاں کہ اُس کی بیگم بہت وفا شعار ہے۔ وہ اپنے شوہر کی ڈانٹ ڈپٹ کو خاطر میں نہیں لاتی۔ مسز ابراہیم کو اپنے بیٹے کا اپنی بیگم کے ساتھ یہ رویہ اچھا نہیں لگتا۔ وہ اپنے بیٹے کو پیار سے سمجھاتی رہتی ہے لیکن اُسے ڈانٹتی نہیں کیونکہ اُن کا خیال ہے کہ وہ اب بڑا ہو گیا ہے۔ اُن کا بیٹا شادی سے پہلے کسی دوسری لڑکی کے ساتھ محبت کرتا تھا جو اُس کی کولیگ تھی۔ وہ اُس سے شادی کرنے کا خواہاں تھا۔ لڑکی کے والدین بھی رضامند تھے لیکن مسز ابراہیم کو یہ رشتہ منظور نہیں تھا وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنی بہن کی بیٹی کے ساتھ کرنا چاہتی تھی جسے اُس نے زبان دی ہوئی تھی۔ بیٹے نے بہت کوشش کی وہ اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔ آخر کار بیٹے نے ماں کی پسند کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے لیکن شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کو وہ حقوق نہ دے سکا جو ایک بیوی کے ہوتے ہیں۔ اب جب اُس کا بیٹا رات گئے گھر کو لوٹتا ہے تو کبھی کبھار اُس کی حالت بڑی تشویش ناک ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ نشے کی حالت میں ہو۔ اُس کے منہ سے عجیب طرح کی بُو آتی ہے۔ مسز ابراہیم کی کل کائنات اس کا بیٹا ہے جو دن بدن تباہی کے گڑھے کی طرف بڑھ رہا ہے اور وہ اپنے بیٹے کو تباہی کے گڑھے کی طرف بڑھتے ہوئے بے بسی سے دیکھتی رہتی ہے۔ وہ خود کو اپنے بیٹے کا مجرم سمجھتی ہے۔ اب وہ موجودہ صورت حال دیکھ کر تسلیم کرتی ہے کہ اُسے اپنی مرضی اپنے بیٹے پر نہیں تھوپنا چاہیے تھی۔ وہ اب اپنے فیصلے پر پشیمان ہے۔ مسز ابراہیم کی کوئی بیٹی نہیں ہے۔ صرف ایک بیٹا ہے۔ نہ ہی اُن کا کوئی بھائی ہے۔ صرف ایک بہن ہے جس کی بیٹی اب اُن کی بہو ہے۔ مسز ابراہیم کا شوہر دو سال قبل اچانک ایک روز چل بسا تھا۔ وہ اُن کو بہت چاہتا تھا۔ اب بھی وہ روز خواب میں اُنہیں ملنے آتا ہے۔۔۔۔ اُسے یہ ساری باتیں مسز ابراہیم اپنے آنسوؤں کی مدد سے ہر روز بتاتی رہتی ہے۔ وہ سات سے آٹھ بجے کا وقت مسز ابراہیم کے پاس گزارتا ہے۔ گزشتہ اتوار وہ اُردو بازار چلا گیا اور وہاں سے اُسے لوٹنے میں دیر ہو گئی اور یوں وہ اُس شام مسز ابراہیم کے پاس نہ جا سکا۔ اگلے روز جب وقت پر اُن کے پاس گیا تو وہ باقاعدہ اُس سے ناراض تھی۔ مسز ابراہیم نے اُسے بتایا کہ نو بجے تک اُس کا انتظار کرتی رہی تھی وہ بہت شرمندہ ہوا۔ اُس نے مسز ابراہیم سے معذرت کی کہ آئندہ ایسی کوتاہی نہ ہو گی۔ مسز ابراہیم کی عمر قریب قریب کوئی پچپن برس ہے۔ جوانی میں وہ یقیناً ایک خوب صورت خاتون رہی ہو گی لیکن اب ان کا چہرہ جھریوں سے اَٹ چکا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ جھریاں اُن کے خاوند کی وفات کے بعد معلوم نہیں کہاں سے اچانک آ دھمکیں۔ اُسے مسز ابراہیم سے مل کر ایک روحانی خوشی کا احساس ہوتا ہے جب وہ روزانہ اُن کے ساتھ ایک گھنٹہ گزار کر اُٹھتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے اُس کی جھولی کسی نے نیکیوں سے بھر دی ہو۔ وہ زندگی میں کبھی کوئی نیک اور پارسا نہیں رہا لیکن کوئی بڑی سے بڑی نیکی کرنے میں بھی اُسے اتنا سرور نہ ہوا ہو گا جتنا اُن سے مل کر ہوتا ہے۔ وہ خود کو اتنا اچھا محسوس کرتا ہے کہ اس کیفیت کو احاطہ بیان میں نہیں لا سکتا۔

اب ماسی نے اپنی قمیص اُتار دی ہے۔ اُس کی زندگی سے لبریز چھاتیاں، جنہیں دیکھ کر یہ

محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انہیں مردانہ ہاتھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی نہ چھوا ہو اُس کے سینے کے بالوں سے اُلجھی ہوئی ہیں۔ وہ اس اچانک رونما ہونے والی صورت حال میں مکمل طور پر جکڑا ہوا ہے۔ وہ ماسی کے اس فعل سے قطعی خوش نہیں ہے۔ وہ اس اخلاقی برائی کا جس کا شاید شکار ہونے والا ہے، کبھی زندگی میں مرتکب ہوا اور نہ ہونا چاہتا ہے۔ ماسی کے بدن کی فطری خوشبو اور ''ڈواٹ'' باڈی سپرے کی خوشبو نے مل کر ایک منفرد خوشبو کا روپ دھارا ہوا ہے۔ وہ اس خوشبو سے جان چھڑوانا چاہتا ہے۔ وہ عمر کے اس حصے میں ہے جس حصے میں صنفِ مخالف کے بدن کی خوشبو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی اُس کا مردانہ پن جوش میں آ جاتا ہے اور کچھ پیش قدمی بھی کر دیتا ہے۔

مسز ابراہیم کے پاس سے اُٹھ کر وہ فلیٹ میں آ کر ایک مرتبہ پھر کتابوں میں محو ہو جاتا ہے۔ عادل کے آنے پر وہ ماسی کا دوپہر کا پکا ہوا کھانا گرم کرتا ہے، دونوں دوست ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد وہ نیچے مارکیٹ میں چلے جاتے ہیں تھوڑی دیر یونہی مختلف سٹوروں میں گھومتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار ضرورت کی کوئی چیز بھی لے لیتے ہیں۔ پھر ہوٹل سے چائے پی کر واپس فلیٹ میں آ جاتے ہیں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹی وی دیکھنے کے بعد قریب قریب ایک بجے سو جاتے ہیں۔ پھر اگلے روز وہی معمول کی زندگی رواں دواں ہو جاتی ہے۔

جب اس کا مردانہ پن جوش میں آ کر کچھ پیش قدمی کرتا ہے تو پھر فوراً ہی اُس کا ضمیر ملامت کرنے لگ جاتا ہے۔ اس صورتِ حال سے چھٹکارا کیوں کر ممکن ہے؟ اس بارے وہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ ماسی کی آواز اُس کے کانوں میں پڑتی ہے۔ ''شاید تمہیں یہ سب اچھا نہ لگ رہا ہو لیکن مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ تم اعتبار کرو یا نہ کرو مگر یہ سچ ہے کہ میں اپنے شوہر کے علاوہ کسی غیر مرد کے ساتھ اس طرح کی حرکت زندگی میں پہلی مرتبہ کر رہی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے میری عمر اس وقت پینتیس برس ہے۔ پندرہ سال کی تھی جب میں بیاہی گئی تھی۔ جس گھر میں مَیں بیاہی گئی تھی وہ ایک کمرے پر مشتمل تھا اور اُس کمرے میں پہلے ہی سے تین جی رہ رہے تھے۔ وہ سخت کورے پڑنے کے دن تھے۔ میں نے پہلی رات اُس کمرے میں اپنے سہاگ کے ساتھ تنہائی میں نہیں گزاری تھی بلکہ تین جی اور بھی تھے۔ اب ہم سات جی ہو چکے ہیں لیکن کمرہ بدستور ایک ہے۔ میرا گھر والا سارا دن محنت مزدوری کرتا ہے۔ جب کبھی ہم دونوں کو تنہائی کے لمحے میسر آتے ہیں تو اُس کے بدن سے اُٹھنے والی بُو میری سرشاری چھین لیتی ہے۔ میں شادی کے بیس سالوں میں ان فطری لمحوں کا مکمل ذہنی آسودگی کے ساتھ مزہ بالکل نہ لے سکی ہوں۔ وہ شادی کے بیس سال ایک طرف اور یہ چند گھڑیاں جو میں تمہارے ساتھ گزار رہی ہوں ایک طرف۔''۔۔۔ پھر اگلے ہی لمحے اُس کی مردانہ قوت پوری شدت کے ساتھ عود کر آئی اور پھر وہ سب کچھ ہوا جو تھوڑی دیر پہلے وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر سب کچھ ہو چکنے کے بعد وہ خود کو یوں ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے کہ جیسے ابھی ابھی مسز ابراہیم کے پاس سے اُٹھ کر آیا ہو۔

☆☆☆

راحت ثمرین خان

باجو

''آ دیکھ یہ ہے وہ نگینہ۔'' خالہ نے عذرا کو بازو سے پکڑتے ہوئے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''کونسی؟''

''اری وہ پیلے کپڑوں والی۔''

تب عذرا نے کہا۔''ہاں ہاں ___ نظر آ گئی خالہ ___ نگینہ کون ہے خالہ؟''

''لو انجان تو ایسی بن رہی ہو جیسے تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔'' خالہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں بولیں۔

''قسم لے لو خالہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تم کیا کہہ رہی ہو؟''

عذرا کے متعجب ہونے پر خالہ نے اُسے راز میں لیتے ہوئے کہا۔''ارے وہی فیروزہ جو بھاگ گئی تھی یہ اس کی بیٹی ہے۔''

تب عذرا کو یاد آیا اچھا تو یہ اس کی بیٹی ہے جو بھاگ گئی تھی۔''بھاگ گئی'' کے الفاظ اس قدر اس کے کانوں نے سنے تھے کہ کہیں بھی یہ الفاظ بولے جاتے تو اُس کے کان غیر شعوری طور پر کھڑے ہو جاتے۔آج بھی اس کی سوالیہ آنکھیں شادی میں آئی ہوئی ان دونوں عورتوں کو دیکھ رہی تھیں جو شاید اس کی رشتہ دار بھی تھیں۔اب خالہ نے عذرا کو تفصیل بتانی شروع کر دی تھی۔

''بیٹا آٹھ سال کا تھا اور یہ بچی چھ سال کی تھی جب وہ کم بخت خصم کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔''

''کس کے ساتھ بھاگی تھی؟'' عذرا نے تشویش ظاہر کی۔

''یہ تو کسی کو بھی نہیں معلوم بیٹا! بس خاندان پر ایک قیامت ٹوٹی تھی۔ارے اس کم بخت نے تو منہ کالا کر لیا اب بچوں کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔'' خالہ آہ بھرتے ہوئے بولیں۔

عذرا نے پھر پولیس والوں کی طرح تفتیش شروع کر دی۔''تو خالہ یہ بچے اب کس کے پاس ہیں اور یہ بچی کس کا بچہ پکڑے ہوئے ہے؟''

''اری اس کی چاچی کا ہے۔چاچی اپنے گھر لے گئی۔اب نوکرانی بنا کر رکھا ہوا ہے۔''

خالہ کے جواب پر عذرا نے پھر پوچھا۔''اور خالہ اس کا بھائی کہاں ہے؟''

''اس کو تو لڑکے کا ماموں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔وہ تو اب ماموں کی ورکشاپ میں کام کرتا ہے۔بس کم بختی تو اس معصوم بچی کی آئی ہوئی ہے۔اسے کوئی رکھنے پر راضی نہیں تھا۔''

''کیوں خالہ؟''

''بیٹی کون گند کور کھتا ہے۔'' خالہ نے یک دم فیصلہ سنا دیا۔

تب عذرا بولی۔''اس میں اِس معصوم بچی کا کیا قصور؟''

اب خالہ تنک کر بولیں۔''عذرا! تمہاری عقل تو گھاس چر گئی ہے۔بھئی سیدھی سی بات ہے بیٹی ماں پر ہی جاتی ہے۔کون بدنامی اپنے ذمے لے۔'' اس کے بعد خالہ کانوں پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے توبہ توبہ کرتے ہوئے آسمان کی طرف منہ کر کے بولیں۔''اے اللہ! تو مجھے ہر گناہ سے بچائیو۔مرنے کے بعد تیرے حضور پیش ہونا ہے اے اللہ! میرا تو سجدے میں دم نکلے۔''

بچی اُنہیں تکے جا رہی تھی کہ اچانک بیگم ریاض کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔''باجو! جلدی اُٹھ منے کو اُٹھا اور گاڑی میں چل کر بیٹھ تیرے چاچا انتظار کر رہے ہیں۔''

''لیکن چاچی میں نے تو ابھی کھانا نہیں کھایا۔'' باجو نے لجاجت سے کہا۔

''اری منحوس کیوں نہیں کھایا؟''

''چاچی میں تو منے کو پکڑے ہوئے تھی۔''

بیگم ریاض اس کی بات سن کر بے پروائی سے بولیں۔''ایسے کر گھر چل کر کھا لینا فریج میں گو بھی پڑی ہوئی ہے۔چل چل جلدی کر منے کو ذرا دھیان سے پکڑا کر و کہیں گر نہ جائے۔''

''اچھا چاچی۔'' کہتے ہوئے وہ جگمگاتے ہال کی جلتی بجھتی بتیوں کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''بیٹا نگینہ آپ نے کھانا کھایا؟'' اس سے پہلے کہ باجو جواب دیتی۔''بیگم ریاض نے شوہر کو جواب دے دیا۔''ہاں ہاں کھا لیا۔''

''باجو منا کیوں رو رہا ہے؟''

''چاچی پتہ نہیں۔'' باجو نے جواب دیا۔تب بیگم ریاض بولیں۔''ایسے کر گاڑی کا شیشہ کھول دے ہوا لگے گی چپ ہو جائے گا۔''

ریاض صاحب اب کی بار ذرا سختی سے بولے۔''بیگم یہ کیا تم نے باجو باجو کی رٹ لگا رکھی ہے۔نگینہ نام اس قدر خوب صورت ہے۔تم نے اس کو چھوڑ کر باجو رکھ دیا۔''

تب بیگم ریاض کا قہقہہ گاڑی میں کچھ زیادہ ہی گونج گیا۔ہنستے ہوئے بولیں۔''یہ آپ کے بڑے صاحب زادے ہیں۔بیچاری جب سے آئی ہے اُسے کبھی باجی کہتا ہے کبھی باجا اور کبھی باجو کہنے لگا۔اب میری زبان پر بھی باجو چڑھ گیا۔''

ریاض صاحب قدرے خفگی سے بولے۔''وہ تو بچہ ہے اس نے نام بگاڑ دیا اور تم نے جہالت کا مظاہرہ کیا۔اگر تمہارا کوئی نام بگاڑ دے تو تمہیں کیسا لگے گا؟''

شوہر کے جواب پر بیگم ریاض اپنے اصلی روپ میں آ گئیں۔ ''آپ دوسروں کی خاطر مجھے بُرا کہتے ہیں ارے ایک تو میں نے بچی کو سہارا دیا اور آپ مجھے اس کی خاطر ذلیل کر رہے ہیں۔'' بیگم ریاض کی بھرائی ہوئی آواز نے ریاض صاحب کو بالآخر خاموش کروا دیا۔ اگلے دن وہ حسبِ معمول کراچی چلے گئے۔ ملازمت کی وجہ سے وہ دو تین مہینوں بعد گھر آتے تھے۔ اس لیے گھر کی کل مختارِ کُل بیگم ریاض ہی تھیں۔

''امی امی! اسد نے باہر روم کولر کا پائپ کھول دیا۔ سارا صحن پانی سے بھر گیا۔'' حنا نے ماں کو اطلاع دی۔

''باجو!____ اری باجو!'' بیگم ریاض کی غصے بھری آواز پر پلک جھپکتے ہی باجو اُن کے سامنے تھی۔ ''اری تجھے گھر کی بھی فکر ہے یا نہیں۔ دیکھ اس شیطان نے روم کولر کا پانی صحن میں پھینک دیا۔''

''چاچی میں کچن میں برتن دھو رہی تھی۔''

''برتن بعد میں دھل جائیں گے۔ پہلے کولر میں پانی بھر پھر صحن صاف کر۔ کمروں میں گرم لُو جائے گی۔'' حکم دینے کے بعد وہ حنا اور اسد کی طرف مخاطب ہوئیں۔ ''چلو بیٹا چلو دیکھ نہیں رہے کیسی لُو چل رہی ہے۔ خدانخواستہ بیمار پڑ گئے تو مجھے ہی پریشانی ہوگی۔''

باجو کی ایک جوتی شاید ٹوٹی ہوئی تھی اس لیے وہ ایک چپل پہنے ہوئے تھی اور دوسری چپل پر پاؤں رکھا ہوا تھا کیونکہ زمین کی تپش اس کے پاؤں کو جھلسا رہی تھی۔ تب حنا اندر جاتے ہوئے دیکھ کر امی سے بولی ''امی جان باجو کی جوتی ٹوٹ گئی ہے۔ زمین بہت گرم ہے میں اپنی جوتی دے دوں۔'' بیگم ریاض نے غراتے ہوئے کہا ''اندر چلو۔'' حنا وہیں دم بخود ہو کر اندر چلی گئی۔

''رقیہ اس مرتبہ تو تین چار سال بعد پاکستان آئی ہو؟'' بیگم ریاض نے بھانجی سے پوچھا۔

''ممانی جان سعودی عرب سے آنا کوئی آسان ہے۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' بیگم ریاض نے رقیہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

رقیہ سارا دن باجو کو کام کرتے دیکھ بہت خوش ہو کر بولی۔ ''ممانی جان! آپ ملازماؤں کے بارے میں بہت خوش قسمت ہیں۔ میرے سسرال والے اور میری امی تو اچھی ملازمہ کو ترستی ہیں۔ اب اس لڑکی کو دیکھو کتنی سمجھدار اور پھرتیلی ہے۔ ایک آواز میں سارا کام کرتی ہے۔''

اتنے میں باجو کو آنکھ مسلتے ہوئے دیکھ کر بیگم ریاض بولیں ''ارے تیری آنکھ کیوں سوجھ گئی؟''

''چاچی! اسد نے لکڑی ماری ہے۔'' باجو درد سے تڑپتے ہوئے بولی۔

''اس کے پاپا کا فون آئے گا تو اس کی شکایت کروں گی۔ تُو آٹا گوندھ۔''

''اچھا چاچی'' کہتے ہوئے وہ کچن کی طرف جانے لگی۔ اتنے میں بیگم ریاض نے ایک اور حکم صادر کر دیا۔ ''باجو میز پر سے چائے کے برتن بھی اُٹھا لے۔''

''اچھا چاچی'' کہہ کر وہ برتن اُٹھانے لگی۔

''ممانی جان یہ آپ کو چاچی کیوں کہہ رہی ہے؟''

''آئے ہائے رقیہ تم باجو کو پہچانی نہیں ہو۔ ارے یہ وہی تو ہے جس کی ماں بھاگ گئی تھی۔''

تب رقیہ کو یاد آیا۔ ''ہاں ہاں خالہ یہ واقعہ تو میری شادی سے پہلے کا ہے۔ ارے میں تو اس بچی کو پہچانی ہی نہیں۔ اب تو ماشاءاللہ بڑی ہوتی جا رہی ہے۔'' باجو کی آنکھوں میں آنسو سوال بن کر رہ گئے تھے اور وہ کچن کی طرف چل دی۔

''ارے چھ سال ہو گئے اس کی ماں کو بھاگے ہوئے۔ دو سال تک تو تیرے میرے گھر پر رہی کسی نے اس بچی کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا۔ سب کہنے لگے کسی کا گند ہم اپنے سر کیوں رکھیں گے۔ پھوپھا نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ میرے تین بیٹے ہیں۔ کل کو لڑکی نے جوان ہو کر ماں جیسے رنگ دکھائے تو ہم تو بدنام ہو جائیں گے۔ رہی باپ کی تو اِدھر بیوی بھاگی اُدھر باپ دوسری شادی کر کے ایسے غائب ہوا کہ پلٹ کر بچوں کی خبر ہی نہ لی۔ تمہیں تو معلوم ہے تمہاری ممانی کس قدر رحم دل اور خدا ترس ہے۔ آخر مجھے اس بچی پر رحم آ گیا۔ تمہارے ماموں اور میں اسے اپنے گھر لے آئے۔''

بیگم ریاض کا خطاب ختم ہوا تو باجو کے آنسو بھی ختم ہو گئے۔ آج اس کا جی چاہا وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ بھاگ جاتی اس کے کان یہ جملہ سن سن کر پک گئے تھے ''یہ وہی ہے جس کی ماں بھاگ گئی تھی۔'' وہ اکثر سوچتی تھی کیا اس کی شخصیت بھی ماں کے ساتھ کہیں بھاگ گئی تھی۔ ''باجو کھانا لگا دے۔'' چاچی کی آواز سنتے ہی وہ حقیقت کی دنیا میں آ گئی جو شاید اس کے ماضی سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔

تمام خاندان والے اپنے بچوں کی شادیاں کرتے جا رہے تھے لیکن باجو کی طرف کسی کو دھیان ہی نہیں تھا۔ ریاض صاحب بھی بیگم کے آگے بغلول بنے ہوئے تھے۔ نہ ہی کسی کا اتنا ظرف تھا کہ باجو کو اپناتا۔ بیگم ریاض کو مفت کی خادمہ ملی ہوئی تھی۔ وہ تو کبھی بھی اس کی شادی کا نہ سوچتیں لیکن اپنے جواری اور عیاش بھائی کو سدھارنے کے لیے اُن کی نظر باجو پر جا پڑی۔ اُن کا بھائی جیل کی ہوا کئی بار کھا چکا تھا۔ تمام خاندان میں اندرونِ خانہ بات پھیل گئی تھی لیکن بیگم ریاض کی ہٹ دھرمی اور زبان درازی کے آگے کوئی چوں نہیں کرتا تھا۔ آخر شوہر کے منع کرنے کے باوجود اُن کی غیر موجودگی میں باجو کا نکاح چار آدمیوں میں بھائی کے ساتھ کر دیا اور اُلٹا تمام خاندان پر احسان کیا کہ آخر لاوارث بچی کو میں نے ہی سہارا دیا۔

اب باجو اُن کے جواری بھائی کے رحم و کرم پر تھی۔ عزیز جوا ہارتا تو اُسے مارتا دھاڑتا، جیت جاتا تو شراب میں دھت گھر آ کر بے سدھ پڑا رہتا۔ کبھی کبھی اس کا دل بھی چاہتا کہ وہ اپنی ماں کی طرح بھاگ جائے۔ اُسے یاد آ رہا تھا کہ جب اس کی ماں بھاگی تھی تو وہ بھاگنے کا مطلب بھی نہیں جانتی تھی۔ اسی لیے ایک دن بڑی معصومیت سے اپنی دادی سے پوچھنے لگی۔ ''دادی جان! اماں تو بھاگ بھاگ کر اب بہت دُور نکل گئی ہوگی۔'' تب اس کی دادی اس کو چمٹا کر رونے لگی۔ سارا سارا دن وہ اکیلی پڑی رہتی۔ یا پھر آئے دن بازار میں عزیز کے جھگڑوں کی خبر سنتی رہتی۔ کبھی پولیس اس کے گھر آ جاتی۔ کبھی غیر لوگ اُسے

تلاش کرنے گھر آجاتے۔اُسے ایسا لگتا وہ گھر میں نہیں کسی سڑک پر کھڑی ہے۔چاچی کا گھر ذرا دُور تھا۔ اکیلے جانے کا سوال ہی نہیں تھا اور نہ ہی اس کا دل چاہتا تھا۔

ریاض صاحب بیگم سے خفا خفا رہتے تھے۔اُن کا ضمیر انہیں کچوکے لگاتا تھا اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ دوسرے خاندان والوں کی طرح انہوں نے بھی ایک ماں کے بھاگنے کی سزا اس کی بیٹی کو دی۔آج یہ احساسِ ندامت انہیں کچھ زیادہ ہوا جب باجو سوال بن کر ایک بار پھر اُن کے سامنے کھڑی تھی۔وہ اس کے پیچھے پولیس اور سفید چادر میں لپٹی نعش کو دیکھ کر سکتے ہی میں رہتے اگر کانسٹیبل یہ نہ کہتا کہ ''جناب اس کا میاں جوئے کے اڈے پر قتل ہو گیا ہے۔رپورٹ لکھوانے کے لیے آپ ہمارے تھانے میں آجانا۔''

بیگم ریاض ڈرامائی ماتم کے بعد مطمئن تھیں کہ پھر سے ایک خادمہ مل گئی تھی۔وقت گزرتا گیا لیکن باجو کے تعارف میں کوئی کمی نہیں آئی۔کئی سالوں کے بعد آج پھر رقیہ اپنی ممانی کے گھر آئی۔باجو کو دیکھتے ہی پہچان گئی اور بولی ''ممانی یہ وہی باجو ہے نا جس کی ماں بھاگ گئی تھی۔''

اب بیگم ریاض نے راگ الاپنا شروع کر دیا۔''اس کے تو نصیب ہی خراب ہیں۔میں نے تو اس بچی کی شادی اپنے سگے بھائی سے کر دی تھی۔نصیب کسی کے جھگڑے میں وہ کود پڑا اور اُسے گولی لگ گئی وہیں مر گیا۔بیچاری کو پھر اپنے گھر لے آئی۔تمہیں تو معلوم ہے تمہاری ممانی کتنی رحم دل اور خدا ترس ہے۔''

حنا کی شادی ہو چکی تھی۔اسد کی آوارگی کے آگے بیگم ریاض اور اُن کی دولت سینہ سپر تھی۔ اسد اگرچہ باجو سے چھوٹا تھا لیکن جوان تھا۔اب اس کی نظر باجو کے ماند حُسن پر پڑتی تھی۔باجو دو سال بعد واپس آئی تھی اس لیے اس کے وہم و گمان میں بھی اسد کا خیال نہیں تھا وہ تو پہلے کی طرح اس کی خدمت کرتی تھی لیکن اب کچھ دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ اسد بہت زیادہ بگڑ چکا ہے۔چاچی سے شکایت کرنا اُلٹا اپنے دامن کو داغ دار کرنا تھا اور ایک رات ایسا ہی ہوا۔

اسد رات دیر سے آتا تھا۔دروازہ کھولنے کی ڈیوٹی باجو ہی کی تھی۔وہ دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔اسد نے دروازہ کھٹکھٹایا۔اس نے کھول دیا۔اسد دروازے پر کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔تب اس نے ہمت کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔''اسد بھائی کھانا کھانا ہے؟''اتنی سی دیر میں اسد کمرے میں داخل ہو کر اس کے ساتھ زبردستی کرنے لگا۔باجو کی بے اختیار چیخ سے بیگم ریاض باہر آگئیں۔باجو تیزی سے بیگم ریاض کی طرف دوڑی۔خوف کے مارے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔اسد نے ماں کو دیکھتے ہی پینترا بدلا۔''ماما اس کے کمرے میں کوئی مرد تھا۔میں جب کمرے میں آیا تو اس نے کھڑکی سے بھگا دیا۔''

بیگم ریاض اگرچہ بیٹے کے کرتوت جانتی تھیں لیکن بیٹا ماں سے دو ہاتھ آگے تھا اور بیگم ریاض

نے الٹا باجو کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔''ارے اس دن کے لیے تجھے پال پوس کر جوان کیا تھا۔بے غیرت تُو مر کیوں نہیں گئی۔میرا بھائی بھی تیری وجہ سے مرا۔ارے تجھے مرد کی عادت پڑ گئی ہے۔اب تو بغیر مرد کے رہ ہی نہیں سکتی۔آخر بیٹی کس کی ہے۔آوارہ ماں کی آوارہ بیٹی۔''ماں نے جب بہت زیادہ واویلا مچایا تو بیٹا ماں کو اندر لے کر چلا گیا۔

چاچا تو پچھلے دنوں ہی کراچی گئے ہیں۔اس لیے اب اُن کا آنا بہت مشکل ہے۔آ بھی جاتے تو کون سا میرے لیے کچھ کر پاتے۔باجو اکیلے کمرے میں بیٹھی سوچتی رہی۔میں کہاں جاؤں؟ کیا میں بھی ماں کی طرح ___ نہیں نہیں ___ لیکن میں کیا کروں؟ وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ اسد پھر دروازے پر کھڑا بے شرمی سے مسکراتے ہوئے بولا۔''کیسی ہو؟ میری خادمہ کیسا رہا رات کا ناٹک۔اگر اب تم چیخو گی تو اس سے بھی بُرا ہو گا۔اس لیے چپ چاپ میرے کمرے میں آجایا کرو ورنہ۔۔۔''اور قہقہہ لگاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

آج رات اسد دروازہ کھٹکھٹاتا رہا لیکن باجو نے مین گیٹ نہیں کھولا۔آخر بیگم ریاض چیختی ہوئی اُٹھیں۔''کم بخت گھوڑے بیچ کر سوتی ہے۔یہ نہیں کہ دروازہ کھول دے۔بچہ کب سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔باجو! ___ باجو! ___ اری منحوس کیا مر گئی۔''جواب نہ پا کر آخر دروازہ خود ہی کھول دیا۔وہ بھی حیران ہو رہی تھیں کہ باجو تو اُن کی پہلی آواز پر آتی ہے یہ آج کیا ہوا؟ تب بیٹے سے بولیں۔''ذرا دیکھ تو سہی یہ باجو کہاں ہے؟''

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور باجو غائب تھی۔اسد بولا''اماں باجو اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔''

''آئے ہائے ___ ارے کل کو مجھ پر الزام آئے گا۔اپنے پاپا کو فون ملا میں انہیں بتاؤں کیا گل کھلایا ہے اُن کی بھتیجی نے۔بڑی حمایت کرتے تھے۔آخر مرد کی رسیا ہو گئی تھی کیسے رہتی بغیر مرد کے۔ چھ مہینے بھی نہیں ہوئے ___ بھاگ گئی ___ جیسی ماں ویسی بیٹی ___''

☆☆☆

ظفر اقبال

دل کو رہینِ بندِ قبا مت کیا کرو
ہے لا علاج ، اس کی دوا مت کیا کرو

ویسے تو اختیار ہے سارا تمہیں ، مگر
جو ناروا ہے اُس کو روا مت کیا کرو

توفیق تو ہوئی نہیں خیرات کی کبھی
کہتے ہیں اس گلی میں صدا مت کیا کرو

جو مل گئے ہیں ، اُن کی تواضع کو چھوڑ کر
جو کھو گئے ہیں اُن کا پتا مت کیا کرو

اس کا معاملہ ہے جُدا ، وضع ہی کچھ اور
دل میں حسابِ تنگیٔ جا مت کیا کرو

کچھ اور لوگ ہیں یہاں اس کام کے لیے
واجب ہے جو بھی قرض ، ادا مت کیا کرو

جیسا بھی ہے وہ یار ہے اپنا کھُلا ڈُلا
کچھ اس لیے بھی خوفِ خدا مت کیا کرو

سچ ہے کہ ہم سے بات بھی کرنا نماز ہے
گر ہو سکے تو اِس کو قضا مت کیا کرو

تم سے تو ہے ظفر کا بس اِتنا مطالبہ
خود سے اُسے زیادہ جدا مت کیا کرو

☆☆☆

ظفر اقبال

اِس کی تو کچھ خبر نہیں کیوں مت کیا کرو
میں اتنا جانتا ہوں کہ یوں مت کیا کرو

جادو سے اک تمہاری خموشی میں بھی عجب
مجھ پر یہ گفتگو کا فسوں مت کیا کرو

آنکھوں کے آس پاس بھی نکلا کرو کبھی
دل میں ہی اتنی دیر سکوں مت کیا کرو

میں نے تو کام لینا ہے ان سے ابھی بہت
میرے خیال و خواب کا خوں مت کیا کرو

خواہش کو دل میں بیٹھنے دو جم کے ایک بار
اب اور اسے درون و بروں مت کیا کرو

نقصان کوئی اس میں تمہارا بھی ہو نہ جائے
مایوسیوں کو اور فزوں مت کیا کرو

مانا کرو بس ایک مری بات سر بسر
اس کے علاوہ جو بھی کہوں ، مت کیا کرو

مقدور بھر تو پہلے ہی رسوا ہوں شہر میں
تم اور مجھ کو خوار و زبوں مت کیا کرو

اُس کا خیال ہے کہ ظفر ، اس کے سامنے
جو بھی کہے وہ ، تم کبھی چُوں مت کیا کرو

☆☆☆

ظفر اقبال

دن رات میرے دل سے گزر مت کیا کرو
اچھا نہیں ہے اِتنا سفر ، مت کیا کرو

مدت کے بعد انہیں جو ہُوا ہے سکوں نصیب
ان پانیوں کو زیر و زبر مت کیا کرو

ہو جائے گی ہماری ملاقات بھی کبھی
یہ خواب ہے تو اِس کو خبر مت کیا کرو

اہلِ غرض بھی ہو کے جو کرتے نہیں سوال
ایسے گداگروں سے حذر مت کیا کرو

مرضی سے اپنی جو بھی کرو ظلمِ ناروا
یہ دوسروں کے زیرِ اثر مت کیا کرو

رہنے دیا کرو یونہی خواب اور خواہشیں
سامان کو اِدھر سے اُدھر مت کیا کرو

نقصان بھی کبھی تو اُٹھانا ہی چاہیے
ہر کام بے زیان و ضرر مت کیا کرو

رونق انہی کے دم سے تمہارے جہاں میں ہے
خلقِ خدا سے صرفِ نظر مت کیا کرو

دل کا دُعا سے رابطۂ خاص ہے ظفر
یوں امتیازِ شاخ و شجر مت کیا کرو

ظفر اقبال

دل میں طرح طرح کے گماں مت کیا کرو
کر لو تو اُن کو آگے بیاں مت کیا کرو

طغیانیاں بھی ہیں کہیں اندر چھپی ہوئی
یخ بستہ پانیوں کو رواں مت کیا کرو

رکھو کہیں کسی کی پہنچ میں بھی جنسِ خواب
یعنی اِسے کچھ اتنا گراں مت کیا کرو

کہتے ہو کیا ، کہ میری تو پہچان ہی نہیں
جو خود نہیں ہے اُس کو نشاں مت کیا کرو

دل میں کسی کے جم کے بھی بیٹھا کرو کبھی
اور ، آئے دن یہ نقلِ مکاں مت کیا کرو

کیوں بھسم ہی اسے نہیں کرتے ہو ایک بار
آ کر ہمارے گھر میں دھواں مت کیا کرو

رونے پہ اختیار کسے ہے ، کوئی بتائے
کہتے ہیں اتنا شور یہاں مت کیا کرو

یا پھر محاوروں کا رکھو ٹھیک سا خیال
یا پیرویِ اہلِ زباں مت کیا کرو

دامانِ دل پہ داغ نہ پڑ جائے ، اے ظفر
اتنا خیال لالہ رُخاں مت کیا کرو

☆☆☆

ظفر اقبال

ہزار بندشِ اوقات سے نکلتا ہے
یہ دن نہیں جو مری رات سے نکلتا ہے

وہ روشنی میں بھی ہوتا نہیں کہیں موجود
جو رنگ ماہِ ملاقات سے نکلتا ہے

مجھے بہت ہے جو خوشبو کا ایک جھونکا سا
کبھی کبھی ترے باغات سے نکلتا ہے

اسی نواح میں آباد ہوں کہیں میں بھی
دھواں جو میرے مضافات سے نکلتا ہے

دل اور طرح کے حالات سے اُلجھتا ہوا
کچھ اور طرح کے حالات سے نکلتا ہے

ثبوت سارا ہمارے خلاف بھی اب تو
ہمارے اپنے بیانات سے نکلتا ہے

جو چاروں سمت گرانی کی ہے فراوانی
تو قحط بھی اِسی بہتات سے نکلتا ہے

وہ لحن جس کا سروکار ہی نہیں مجھ سے
کبھی تو وہ بھی مری ذات سے نکلتا ہے

ظفر، یہ باعثِ تشویش بھی ہے سب کے لیے
جو مطلب اور مری بات سے نکلتا ہے

☆☆☆

ظفر اقبال

وہ جس طرح کے بھی ہنگام سے نکلتا ہے
ہمارا کام ترے نام سے نکلتا ہے

کہیں وہ اپنے ہی کہرام سے نکلتا ہے
جو دیکھنے میں کسی کام سے نکلتا ہے

ہے مستحق وہ زیادہ تری توجہ کا
جو اپنے آپ ترے دام سے نکلتا ہے

ہے یہ بھی چیز مرے کام کی جو شعلہ سا
تمہارے سلسلۂ شام سے نکلتا ہے

جو گھر میں گھستا ہے اُودھم سا اِک مچاتا ہوا
وہ باہر اتنے ہی آرام سے نکلتا ہے

نوید ہو کہ نہ ہونے سے ہے مرا ہونا
شروع بھی مرا انجام سے نکلتا ہے

تو روشنی مرے دالان تک ہی رہتی ہے
جو ماہتاب کسی بام سے نکلتا ہے

چلا جو کرتے ہیں مخصوص لوگ ہی اُس پر
وہ راستہ روشِ عام سے نکلتا ہے

ظفر، کسی کے بھی پلّے نہ پڑ سکے بے شک
ہمارا کام تو اِبہام سے نکلتا ہے

ظفر اقبال

جہاں یہ دل ترے جنجال سے نکلتا ہے
تو جیسے قیدِ مہ و سال سے نکلتا ہے

ابھی حساب نہیں ہو سکا ، ابھی اپنا
کچھ اور تیرے زر و مال سے نکلتا ہے

یہ راز کیا ہے کہ اس بار میری حالت کا
سراغ سا ترے احوال سے نکلتا ہے

سمجھتے ہیں کہ ترے گھر کا راستہ شاید
ہمارے سبزۂ پامال سے نکلتا ہے

تری جزا و سزا کا معاملہ بھی کہیں
ہمارے نامۂ اعمال سے نکلتا ہے

رواں ہیں دل کی طرف سے ہرے بھرے آنسو
یہ چشمہ بھی اُسی پاتال سے نکلتا ہے

میں یادگار ہوں اپنے پرانے وقتوں کی
کہ ماضی اب بھی مرے حال سے نکلتا ہے

ابھی نہیں کسی تفصیل کی طلب ہم کو
کہ مدعا ابھی اِجمال سے نکلتا ہے

یہی بہت ہے کہ پرواز کے بجائے ، ظفر
جو حوصلہ سا پر و بال سے نکلتا ہے

ظفر اقبال

کہاں وہ کوششِ بسیار سے نکلتا ہے
جو کام طعنۂ اغیار سے نکلتا ہے

تجھے خبر نہیں ، پہلو ہماری صحت کا
کبھی کبھی ترے آزار سے نکلتا ہے

کہاں پہنچنا ہے اِس کو، یہ سب خبر ہے مجھے
جو راستہ ترے انکار سے نکلتا ہے

لگی ہے آگ تو دریا کے اِس کنارے پر
دھواں سا کس لیے اُس پار سے نکلتا ہے

ہوا نہ ہو بھی تو وقفوں کے ساتھ اب بھی کبھی
غبار سا مرے آثار سے نکلتا ہے

ہمیں خبر ہے بہت ، اور ہی کوئی مطلب
ہماری گرمیٔ بازار سے نکلتا ہے

کیا ہے جمع تو یہ خارخس ، اور اب دیکھیں
نتیجہ بھی کچھ اِس انبار سے نکلتا ہے

کبھی کبھی ہو برامد بھی اِس مشین سے شعر
تو اک تھکی ہوئی رفتار سے نکلتا ہے

تعلق اپنی بہت لاتعلقی کا ، ظفر
کسی ہمارے سروکار سے نکلتا ہے

☆☆☆

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

قامتوں کی جوانی بھی کجلا گئی شہر ویراں ہوئے اب کدھر جاؤ گے
جن غزالوں سے کل تک تعلق رہا اُن کا کردار سُن لو تو مر جاؤ گے

دوسروں کی زمیں سے نکالے ہوئے اپنے گھر بھی پہنچ کر شگفتہ نہیں
اُن سے پوچھو یہاں سے جو ہانکے گئے پھر رکو گے کہاں کس کے گھر جاؤ گے

کارواں گم ہوئے ، راستے مٹ گئے ، درد کے باہمی رابطے کٹ گئے
اب کہاں تک سروں پر اُڑاتے ہوئے آرزو کا غبارِ سفر جاؤ گے

کچھ دنوں بعد بازار افرنگ میں ہم غریبوں کا نیلام ہونے کو ہے
اپنی تخریب کا کچھ ازالہ کرو ورنہ بے موت جاں سے گزر جاؤ گے

عمر تھوڑی ہے بیدار ہو کر جیو لمحے لمحے کو تقطیر کر کے پیو
یہ فقیروں کا ہے نسخۂ کیمیا ، آزما لو تو اک دن بکھر جاؤ گے

وقت کہتا ہے لوٹی ہوئی نقدیاں اک نہ اک روز تقسیم ہوجائیں گی
یہ تو مجبور لوگوں کی میراث ہیں ان کا لقمہ بنا کر کدھر جاؤ گے

☆☆☆

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

روح کیا ہے جسم فانی میں قیام اس کا ہے کیوں
بے سبب اعصاب انسانی میں کام اس کا ہے کیوں

وسعتوں میں کیوں نہ اس کی جائے پیدائش ہوئی
روئے ارضی کی سمادھی میں مقام اس کا ہے کیوں

قدرتِ خلقت کی لاتعداد تشکیلات میں
دم بدم کارِ زمانہ ناتمام اس کا ہے کیوں

لفظ پر آفت کہ معنی پر نہیں اس کی گرفت
پھر بھی کہتے ہیں بہت مشکل کلام اس کا ہے کیوں

کس لیے ابلیس آدم کا مخالف بن گیا
کارگر کردار انسانی پہ دام اس کا ہے کیوں

کس قدر دل کش نظر آتا ہے طرزِ دلبری
مصلحت کوشی میں اس درجہ سلام اس کا ہے کیوں

چال میں بھی پہلی جیسی تمکنت باقی نہیں
سوقیانہ رنگ سے اب کے خرام اس کا ہے کیوں

ابرار عابدؔ

احساس کی قیمت ہیں سنبھالے ہوئے ہم
کس حال میں دنیا کے حوالے ہوئے ہم

دے دیں گے تنفّر کے اندھیروں کو شکست
ہیں نور محبت سے اُجالے ہوئے ہم

خلقت پہ ہماری ہی خدا نازاں ہے
ہر چند ہیں جنت سے نکالے ہوئے ہم

اُمید سحر دل میں لیے بڑھتے رہے
اندیشۂ ظلمات کو ٹالے ہوئے ہم

ہیں پستیٔ افکار سے مصروفِ نبرد
الفاظ کو تلوار میں ڈھالے ہوئے ہم

سچ بول کے اس بات پہ مغموم بھی ہیں
کیوں سینۂ احباب کے چھالے ہوئے ہم

زندہ تو سبھی رہے ہیں عابدؔ لیکن
زندہ ہیں غمِ عشق کو پالے ہوئے ہم

☆☆☆

اسلم سحابؔ ہاشمی

دامنِ دشت میں اِک رنگ گلستاں بھر دو
کم نگاہوں کی نگاہوں میں بھی امکاں بھر دو

جن کو بے نام و نشاں رکھا ہے دنیا نے سدا
اُن کی بے نام سی ہستی میں بھی عنواں بھر دو

دیکھنا پھر یہ خزاں کیسے چمن چھوڑتی ہے
اپنے احساس میں تم حُسنِ بہاراں بھر دو

جو کناروں سے نکل کر بنے صحرا کی حیات
ٹھہرے دریاؤں میں اِک ایسا ہی طوفاں بھر دو

خود منازل کے نشاں تم پہ عیاں ہوں گے سحابؔ
اپنی سوچوں میں بس اِک نورِ درخشاں بھر دو

اسلم سحابؔ ہاشمی
(مجید امجد کی زمین میں)

ہیں شاخِ یاد پہ نکہت فشاں گلاب کے پھول
کہ زخمِ دل کے ہیں الفت نشاں گلاب کے پھول

روش روش پہ وہ یادوں کے پھول مہکے ہیں
وہ نقشِ پا ہیں کہ یا ارغواں گلاب کے پھول

بساطِ خاک پہ رکھا ہے کیوں تضاد کا رنگ
یہاں یہ خون کے چھینٹے، وہاں گلاب کے پھول

اِک ایسی فصلِ بہاراں نصیب ہے ہم کو
برستی آگ میں نوحہ کناں گلاب کے پھول

سحابؔ بات جو لفظوں سے ہو نہ سکتی ہو
تو ایسی بات کو دیں گے زباں گلاب کے پھول

☆☆☆

شارقؔ بلیاوی

خودی کی انتہائے مات کہیے
محبت کو شکستِ ذات کہیے

اثر انگیزیٔ حالات کہیے
کچھ اپنے بھی تو احساسات کہیے

بہت تمہید سن لی بندہ پرور
جو کہنا چاہتے ہیں بات کہیے

در و دیوار پر مٹی جمی ہے
کسی سے گھر کے کیا حالات کہیے

پشیمانی کی باعث بن نہ جائے
سمجھ کر سوچ کر ہر بات کہیے

ہے دانا کے لیے کافی اشارا
جو ناداں ہو تو کھل کر بات کہیے

بھلا کام آئیں گے کب استعارے
وفا کو دن جفا کو رات کہیے

کوئی پوچھے تو چپ رہتے اے شارقؔ
کسی سے کیا کسی کی بات کہیے

شارقؔ بلیاوی

کوشش پئے بہ پئے میں اک سانحہ یہ گزر گیا
سرکا نہ بار کم ہوا ہاں میرا سر اُتر گیا

کم نگہیِ شوق تھی موسمِ جاں سے بے خبر
بھرنے اُڑان آیا تھا کھو کے میں بال و پر گیا

میخانۂ حیات سے مئے نہ ملی تو کیا ہوا
اوس کی بوند بوند سے جامِ حیات بھر گیا

کارگہہِ شعور میں حائل تھا لاشعور بھی
کرنا تھا جو وہ رہ گیا کرنا نہ تھا جو کر گیا

طور طریق کچھ نہیں معرکۂ حیات میں
جینا تھا جس کو جی لیا مرنا تھا جس کو مر گیا

نقشِ قدم سے بھر دیا جو بھی تھی رہ گزارِ شوق
کس نے کہا کہ رائیگاں زندگی کا سفر گیا

ساحل تھا اپنی نیند میں موجیں بھی بے خبر سی تھیں
دریا سے مجھ کام تھا چپکے سے میں اُتر گیا

کوئے بتاں میں دیکھ لو ہوگا اِدھر اُدھر کہیں
شارقِ خستہ حال کا گھر ہے کہاں کدھر گیا

☆☆☆

حصیرؔ نوری

سوچ میں اپنی کوئی راہ گزر بھی رکھو
دوست دشمن پہ مگر اپنی نظر بھی رکھو

حبس بڑھ جائے نہ اتنا کہ گھٹے دم لوگو
اونچی دیوارِ انا میں کوئی دَر بھی رکھو

اپنا گھر پہلے رکھو سنگ زنوں کی زَد پر
اپنے آنگن میں جو چاہو تو شجر ہی رکھو

برف باری میں بھی کچھ دھوپ کی اُمید رہے
شب کی آغوش میں اک نورِ سحر بھی رکھو

دشتِ وحشت کہ بھلا بے در و دیوار ہو کیوں
دستکوں کی ہو جو اُمید تو گھر بھی رکھو

ڈھونڈنا خود کو ہجوموں میں اگر ہو مقصود
اپنی آنکھوں میں زمانے کی نظر بھی رکھو

عارضی طور لگا لو کوئی خیمہ بھی حصیرؔ
دل میں محفوظ مگر عزمِ سفر بھی رکھو

حصیرؔ نوری

تلوؤں میں جلتی ریت سے گو آبلے ہوئے
ہم چل رہے ہیں ٹیسوں کی جھیلیں لیے ہوئے

جلتے دیے بجھائے نہ کوئی مکان سے
سورج نکل رہا ہے اندھیرا لیے ہوئے

جذبات میں ابال جو آنا تھا آ گیا
لیکن دلوں میں بغض ہیں اب تک بھرے ہوئے

جو جانتے نہیں ہیں نشیب و فرازِ وقت
انجان راستے پہ وہی ہیں کھڑے ہوئے

دشمن تو پہلے ہی سے ہمارے ہیں معترف
کیوں ہاتھ دھو کے دوست ہیں پیچھے پڑے ہوئے

یہ مارِ آستیں کا نہیں دَور ، آج کل
سونے کے سانپ ہیں تہہِ داماں چھپے ہوئے

اپنے ہی پاس رکھئے شعور و خرد حصیرؔ
ہر آدمی کے ہوش ابھی ہیں اُڑے ہوئے

☆☆☆

صابرؔ عظیم آبادی

تصورات کا جب چاند مسکراتا ہے
مرے وجود کا ہر ذرّہ مسکراتا ہے

بکھیرو ! اپنے تبسم کی چاندنی ہر سُو
دکھوں میں رویا نہیں مسکرایا جاتا ہے

نہیں ہے خوف بھٹکنے کا راہِ ہستی میں
ترا خیال مجھے راستہ دکھاتا ہے

اُسی کی یاد کو میں زندگی سمجھتا ہوں
وہ ایک شخص جو میری ہنسی اُڑاتا ہے

وفا ہے جرم تو اس عہد کا کوئی منصف
یہ دیکھنا ہے مجھے کیا سزا سناتا ہے

شناوری کا سلیقہ جسے نہیں آتا
کنارِ آب وہی شخص ڈوب جاتا ہے

جسے پتا ہی نہیں اونچ نیچ کا صابرؔ
اُسی کو وقت چڑھاتا ہے اور گراتا ہے

صابرؔ عظیم آبادی

دیارِ جسم کی سرحد سے آگے
نہ جائے کوئی اپنے قد سے آگے

ٹھہرتا آئینے کا عکس کتنا
ترے چہرے کے خال و خد سے آگے

کوئی پہچان کا پتھر کرو نصب
عزیزو! تم مرے مرقد سے آگے

وہی گرتا ہے منہ کے بل سفر میں
جو بڑھنا چاہتا ہے حد سے آگے

اُسے منزل نہ مل پائی ابھی تک
گیا جو منزلِ مقصد سے آگے

نہ جاؤ دھوپ کا صحرا ہے ہر سُو
پرندو! اس ہرے برگد سے آگے

ذہانت ہے بلا کی اس میں صابرؔ
جو بچہ سِن رہا ہے صد سے آگے

☆☆☆

پرویز ساحرؔ

چار دن کی یہ زندگانی کیا
اور پھر اپنی خوش گمانی کیا

کس لیے نیند آ رہی ہے مجھے
ختم ہونے کو ہے کہانی کیا

بارِ غم بھی اُٹھا نہ پائیں ہم
بارے ، اتنی بھی ناتوانی کیا

تم کہ اس درجہ سنگ دل تو نہ تھے
مَر گیا آنکھ کا بھی پانی کیا

کس سے دیکھی ہے یہ ادائے خاص
میرؔ کی سی یہ بدگمانی کیا

اتنی مہلت بھی ہم کو کافی ہے
مانگیے عمرِ جاودانی کیا

میں اگر حالِ دل سناؤں تمہیں
سُن سکو گے مری زبانی کیا

تو یہ طے ہے کہ سب کو جانا ہے
جائے عبرت ہے دارِ فانی کیا

کچھ بھی جب اپنی دسترس میں نہیں
کھینچیے رنجِ رائیگانی کیا

شہرِ بے درد میں ، محبت کی
کوئی بنیاد اب اُٹھانی کیا

یوں بھی کرتا ہے کوئی دُنیا میں
اپنے عاشق سے آنا کانی کیا

ہر کوئی شخص مجھ سے پوچھتا ہے
ہے کوئی تیرا یارِ جانی کیا

کس لیے اتنے کھوئے کھوئے ہو تم
بات یاد آ گئی پرانی کیا

کیوں نہیں تم پہ کچھ اثر ہوتا
بجھ گئی آتشِ جوانی کیا

سب کمالِ ہنروری ہے یہ
ورنہ الفاظ کیا ، معانی کیا

دوستوں کو پسند آیا ہے
میرا اندازِ گُل فشانی کیا

تم جو چھپ چھپ کے شعر پڑھتے ہو
ہے تمہیں شوقِ شعر خوانی کیا

جو بھی سچ ہے ، بتائے دیتے ہیں
کیجیے اب غلط بیانی کیا

تم جو نکتے بجھا رہے ہو مجھے
تم کو آتی ہے نکتہ دانی کیا

اپنا اظہار بھی نہ کر پاؤں
ساحرؔ ایسی بھی بے زبانی کیا

☆☆☆

اوصاف نقوی

زندگانی کا یوں نظام اُداس
جیسے ہوتی ہے میری شام اُداس

اب تو کاغذ بھی منہ چڑاتا ہے
جُز ترے نام میرا نام اُداس

دھند چھائی ہے یوں اذیّت کی
شہر کے سارے خاص و عام اُداس

گری دیوار یوں ارادے کی
جیسے تقدیر کا ہو جام اُداس

کیسے اوصافؔ میں کہوں اُس سے
وہ نہیں ہے تو ہے کلام اُداس

اوصاف نقوی

ڈھونڈتا ہے کیا زمانہ بے بسی کی ریت میں
دفن ہے کس کا خزانہ بے بسی کی ریت میں

نوحہ دہراتی ہوئی آتی ہے اک پانی کی بوند
کیا کہوں کوئی ترانہ بے بسی کی ریت میں

لو کے جھونکے ، تشنگی باراں کی اور تنہائیاں
ہے کوئی منظر سہانا بے بسی کی ریت میں

اشک ریزوں سے تھا لکھا ریگِ صحرا پر کبھی
کیا ہوا میرا فسانہ بے بسی کی ریت میں

موسموں کی تہمتیں کیوں تیرے سَر آئیں بھلا
اے ہوا چہرہ چھپانا بے بسی کی ریت میں

پوچھتے اوصافؔ ہو تم میرے مسکن کا پتہ
ہے مرا مسکن پرانا بے بسی کی ریت میں

☆☆☆

عظیم حیدر سیّد

ہماری خواہشوں نے گھر کو یوں گنجان رکھا ہے
نہیں معلوم کس کمرے میں کیا سامان رکھا ہے

ہر اِک منظر سے میری آنکھ کی بینائی چپکی ہے
مجھے اس آئنے نے اس قدر حیران رکھا ہے

یہ تتلی اس لیے بھی کھڑکیوں سے سر پٹختی ہے
کسی نے گھر کے کمرے میں کہیں گلدان رکھا ہے

ہماری آنکھ کے منظر بھی ہم پر کھل نہیں سکتے
کسی نے درمیاں میں ایسے پردہ تان رکھا ہے

اگر حیدر مرے سینے میں بھی اِک دل دھڑکتا ہے
اُسے کہنا مجھے پھر کس لیے بے جان رکھا ہے

☆☆☆

نیم پابند غزلیں

خاورؔ اعجاز

کبھی چہرہ کبھی غازہ نہیں ملتا
بکھرنے والی تصویروں کا شیرازہ نہیں ملتا

کبھی اِک ساتھ چلتے تھے مگر اَب تو
تمہیں منزل ہمیں رستوں کا اندازہ نہیں ملتا

یہ شہرِ بے مروّت اور کیا دے گا
یہاں کے باسیوں سے زخم بھی تازہ نہیں ملتا

کہیں سے آ رہی ہے جاوداں خوشبو
مگر اُس شہرِ جاں کا صدر دروازہ نہیں ملتا

وہ قطرہ ، ہم سمندر فرض کرتے ہیں
ہمارا اور اُس کا کوئی اندازہ نہیں ملتا

خاورؔ اعجاز

اپنا پھول وجود گنوا کر آیا ہوں
لیکن خوشبو کے آسیب سے بچ نکلا ہوں

سونپ رہا ہوں شعلوں کو سربستہ راز
میں ماضی کو آتش دان میں پھینک رہا ہوں

تصویروں کا رنگ بھی کچّا نکلے گا
البم کو تو ہاتھ لگا کر دیکھ چکا ہوں

وہ گلدان کا پتھر تھا سو قائم ہے
میں خوشبو تھا، پھول سے اُڑ کر شرمندہ ہوں

گھنگھرو کی آواز میں کچھ آسیب نہ تھا
میں تو دیوی کو چھونے سے پتھرایا ہوں

☆☆☆

خاورؔ اعجاز

کب تک دلِ خوش فہم کو دیتے رہیں موہوم دلاسے
بے سُود ہے خوشبو کی تمنا ہی ہوا سے

کچھ میری طبیعت کا بھی ہے دخل جو ٹوٹے ہیں مراسم
کچھ تُو بھی تو مجبور رہا اپنی اَنا سے

تم دیکھنا اِس دَور کی ظلمت کبھی چیخے گی کہ لاؤ
وہ نُور جو پھوٹا تھا کبھی غارِ حرا سے

اے ابر کے ٹکڑے ہمیں ترسا کے تجھے کچھ نہ ملے گا
ہم لوگ تو دریا میں بھی رہ لیتے ہیں پیاسے

اُس وقت مرے عہد کے نقاد کہاں سوئے ہوئے تھے
جب ضبط ہوئے تھے مرے حرفوں کے اثاثے

خاورؔ اعجاز

نئے سفر کی سزائیں دے کر چلا گیا ہے
وہ شخص مجھ کو رفاقتوں کی دعائیں دے کر چلا گیا ہے

مرے تجسس کے دائرے میں ہوا تھا داخل
مگر ہر اک قوس کو عجب انتہائی دے کر چلا گیا ہے

وہ میں نے جس کی ہتھیلیوں پر چراغ رکھے
وہ جونہی روشن ہوا تو مجھ کو ہوائیں دے کر چلا گیا ہے

سبھی فصیلوں پہ برف موسم جما ہوا ہے
نئے دسمبر کا زرد سورج صدائیں دے کر چلا گیا ہے

کڑے زمانوں میں ایک درویش آ گیا تھا
فقیر لمحوں کو عظمتوں کی قبائیں دے کر چلا گیا ہے

☆☆☆

خاورؔ اعجاز

ابھی بقا کے سوال پر غور کر رہی ہے
یہ زندگی اہلِ معرفت کی مثال پر غور کر رہی ہے

کچھ اِس قدر انہماک ہے موجودات میں بھی
کہ جیسے ہر ایک شے خود اپنے مآل پر غور کر رہی ہے

کبھی تو اُس کا سراغ مل جائے گا یقیناً
خرد ازل سے کسی کے اِک اِک کمال پر غور کر رہی ہے

جہان پھیلاؤ کے سفر میں رواں ہے لیکن
مشیّت اس کو سمیٹنے کے خیال پر غور کر رہی ہے

یہ حال ہونے لگا ہے اپنی فراستوں کا
کہ جیسے جاہل کی عقل توتے کی فال پر غور کر رہی ہے

خاورؔ اعجاز

یہ صحافت کا ہے معیار تو کردار نہیں بن سکتے
جھوٹ خبروں سے تو اخبار نہیں بن سکتے

منصفو ہر تو ہمیشہ سے ہی کٹتے چلے آئے ہیں مگر
اب کے وہ ظلم کے مینار نہیں بن سکتے

جل گئے ہو تو نمائش کے لیے آگ میں کودے کیوں تھے
میں نہ کہتا تھا کہ گلزار نہیں بن سکتے

حرف کے زہر کو تریاق بنانا ہی تو فنکاری ہے
صرف باتوں سے تو فنکار نہیں بن سکتے

شوق کا چاند کوئی ذہن کی محراب پہ رکھو ورنہ
سوچ لمحے کبھی شہکار نہیں بن سکتے

☆☆☆

خاورؔ اعجاز

منزل دُور نکل جاتی ہے تھکنے والوں سے
چلتی راہوں اور ساکن قدموں میں رشتہ کب ہوتا ہے

تاریکی میں ہو سکتا ہے بچنے کا امکان
روشنیوں کا زخم لگے جس کو وہ اچھّا کب ہوتا ہے

کب مقتول کا دَرد کسی قاتل نے پہچانا
تیر چلانے والا اُس کے غم میں تڑپا کب ہوتا ہے

دیکھیں شہر کی گلیوں میں پھر اُڑتی ہے کب خاک
دیکھیں ضبط کی نگری میں پھر ظلم تماشا کب ہوتا ہے

ایک حقیقت سب کے اندر رہتی ہے لیکن
اپنے آپ سے باہر اُس کے ساتھ نکلنا کب ہوتا ہے

خاورؔ اعجاز

وہ میں ہوں گا کہ تم کوئی تو ہوگا
کسی کو تو اَنا کے مورچے میں نیند آئے گی

بہت جاگے سفر سے پیشتر ہم
سو اَب منزل سے پہلے راستے میں نیند آئے گی

کھلی آنکھوں نہ دیکھا شوق منظر
ہمیں معلوم تھا اس مرحلے میں نیند آئے گی

بہت سے خواب ہیں رستے میں لیکن
مسافر کو تو اپنے جھونپڑے میں نیند آئے گی

کھلے گی آنکھ جب روحِ سفر کی
تو اس لمحے کو چھُو کر دیکھنے میں نیند آئے گی

کہاں بیدار لوگوں کی رفاقت
ہمیں تو ایک ساعت جاگنے میں نیند آئے گی

نئی سرحد کھلے گی آگہی کی!
محیطِ وقت کے جس دائرے میں نیند آئے گی

☆☆☆

خاورؔ اعجاز

ذرّہ اپنی ذات میں صحرا ہوتا ہے
قطرے میں جیسے عکسِ دریا ہوتا ہے

بند گلی کے آخر تک بھی ہو آنا
دیواروں میں کبھی کبھی رستہ ہوتا ہے

بے فکروں کو فکر زیادہ ہوتی ہے
چھوٹے لوگوں کا شملہ اونچا ہوتا ہے

جسم ہی سُونا، جسم ہی مشتِ خاک بھی ہے
جسم ہی کندن، جسم ہی رزقِ ہوا ہوتا ہے

سورج چھُو کر جل جانے کے بعد کھلا
اپنی قامت میں رہنا اچھّا ہوتا ہے

جو خاموش طبیعت چپ سے رہتے ہیں
اُن کا جذبہ ساگر سے گہرا ہوتا ہے

اپنے ہاتھ میں ساری بات نہیں ہوتی
کچھ حصہ تقدیر میں بھی لکھا ہوتا ہے

روشن کرداروں کے قد و قامت میں
سایہ شامل کر دینے سے کیا ہوتا ہے

حرف وہی ہوتے ہیں سب کی باتوں میں
باقی تو اپنا اپنا لہجہ ہوتا ہے

☆☆☆